اُردو ادب

غزل

قصیدہ

داستان

افسانہ

آرزو چودھری ایم۔اے

علمی کتاب خانہ اُردو بازار لاہور

اُردو اَدب

غزل

قصیدہ

داستان

افسانہ

آرزو چودھری ایم۔ اے

اسلم کے نام

غزل اور اس کا ارتقاء

ایک دھان پان سی دوشیزہ جس کے کومل تن پر مہین لباس بھی گراں گزرتا ہو۔ بھاری زرہ میں کیسے شگفتہ رہ سکتی تھی لکھنؤ نے اپنی نازک مزاجی کے باوجود اس صنف نازک و لطیف پر فولادی لباس چڑھا دیا جس میں اس کا سیمیں اور شعلہ آسا حسن دب کر رہ گیا۔

غزل ہماری شعرو شاعری کا بیش بہا سرمایہ ہے اردو اصنافِ سخن میں اسے وہی حیثیت حاصل ہے جو پھولوں میں شگفتہ گلاب کو۔

غزل ہمارے فکری اور ذہنی اقدار کی امین رہی ہے۔ اور ہماری تہذیب کی بانہوں میں بانہیں ڈالے۔ کمتی سال سے زندگی کی حسین لکیروں پر شعلہ آسا بڑھتی چلی آ رہی ہے۔

غزل میں بے پناہ کشش ہے جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگوں کے دلوں کی آواز ہے۔ اور اس میں وہ اپنے جذبات مچلتے ہوتے دیکھتے ہیں۔ اور گویا اس طرح اس میں آفاقیت ہے ——— اور پھر یہ اس آفاقیت ہی کا فیض ہے کہ جو اسے سنتا ہے۔ "پروانہ وار" سینہ شگافی" کے مزے لینے لگتا ہے۔

غزل کی خراش تراش اور بناوٹ کے بارے میں کوئی مخصوص سانچہ نہیں تھا جس کسی نے جس طرح بھی اس کی مانگ پٹی سنوار دی، اسی طرح اٹھ کر سامنے چلی آئی۔ البتہ ولی سے امیر مینائی تک کچھ ہستیاں ایسی ضرور ہو گزری ہیں۔ جنھوں نے اس کے اصول، اور قاعدوں کی طرف ہلکے ہلکے اشارے کئے ہیں دیکھا جائے تو حالی، حقیقت میں۔ وہ پہلے شخص ہیں۔ جنھوں نے غزل کو گہری نگاہوں سے دیکھا

ہے۔ اور اس کے نئے ضابطے متشکل کئے ہیں۔ آج ہمارے سے غزل کے جو اصول ہیں، وہ انہی کے رہین منت ہیں۔

حالی کے علاوہ خواجہ امام امداد اثر کی کتاب "کاشف الحقائق" اور موجودہ دور میں یوسف حسین خان، پروفیسر سید مسعود حسن۔ فراق۔ نیاز فتحپوری۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ پروفیسر حمید احمد خان، پروفیسر کلیم الدین کے مضامین قوانین غزل کی تنقید میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

غزل ایک حسین و شوخ دوشیزہ کی مانند ہے جس کا روپ سروپ اپنی تمامتر رعنائیوں کے ساتھ جوان ہے اور جو اپنے جمال کی سحر خیزیوں سے دلوں میں پیار و محبت کا جوار بھاٹا تخلیق کرتی۔ وقت کی تال پر دھیرے دھیرے پگ دھرتی چلی جا رہی ہے روپ کی آنچ کے ساتھ ساتھ اس میں ادائیں ہیں۔ ناز و نخرے ہیں۔ غمزے ہیں، آہیں ہیں تبسّم ہے۔ مسکراہٹیں ہیں۔ انانیت ہے۔ گھمنڈ ہے۔ اور غصہ ہے۔ گویا یہ جمال و جلال کی ایک پوٹ ہے۔ امیروں کی محفل میں پہنچ گئی تو دل لوٹ لئے۔ غریبوں کے ڈیرے میں آئی تو صبر و متاع چھین لیا۔ صوفی کے تکیوں میں سے ہو گزری تو "ہو حق" کے نعرے لگنے لگے۔ قلندروں نے اسے دیکھا تو سینے چاک کر لئے ——

زاہدوں پاکبازوں نے اسے پایا تو ہنگامہ برپا کر دیا —— شیخ نے قدموں کی چاپ سنی تو نعرہ لگایا اور رندان خوار کے تصور میں بھی چلی آئی تو اس کی مستی میں آکر جام سے چوم لیا ——

غزل میں کتنے رنگ جمع ہوتے تب کہیں جا کر یہ "غزل" بنی ہے —— اس میں رمزیت ہے۔ ایمائیت ہے۔ اجمال ہے۔ لوچ ہے۔ نغمگی ہے۔ موسیقی ہے۔ اور یہ وہ مدہوش کن شے ہے جو دل اور دماغ دونوں کو جھنجھوڑتی اور روح میں اتر جاتی ہے ——

جس طرح ایک خوبصورت مجسمہ مختلف اعضا۔ کے تناسب سے وجود میں آکر روپ و رعنائی بکھیرتا ہے ، بعینہٖ غزل مواد ، ہیئت ، موضوع اور صورت کی ایک متناسب اور متوازن ہم آہنگی کے ساتھ ظہور پذیر ہوتی ہے ۔ مواد ، ہیئت ، موضوع اور صورت غزل کا روپ اور لہو ہیں ۔ غزل کی سج دھج ہیں ۔ غزل کی روح ہیں ۔ ان میں کمی بیشی غزل کے حسن کو ماند کر دیتی ہے اور جب تک ان میں ہم آہنگی پیدا نہ ہو یہ نکھرتی ہی نہیں ۔ یہ چاروں غزل کے لئے اہم ہیں ۔ جو فنکار ان کی اہمیت کو نظر انداز کر دیتا ہے اور جس کے یہاں اس ہم آہنگی کا ذوق اور شعور نہیں اور جو موضوع کو اپنے مزاج کا جزو نہیں بناتا وہ اپنی غزلوں میں تاثر پیدا نہیں کر سکتا ۔ اس کی غزلیں ، غزلیں تو ہوتی ہیں لیکن ایسی غزلیں جن میں لہو نہیں ۔ حرارت نہیں ۔ حسن نہیں ، وہ مٹھاس اور شیرینی سے تہی ہوتی ہیں ——— کیوں کہ فن کی جان خلوص اور عرق ریزی ہے ۔ فن کے اہم عناصر پر توجہ نہ دی جاتے تو فن ، فن نہیں رہتا کچھ اور ہی بن جاتا ہے ۔

غزل کی اساس معاملات عشق و حسن کی مختلف کیفیات اور واردات پر استوار کی گئی ہے ۔ اس میں وہی امنگیں ۔ وہی جذبات ، اور وہی ذہنی و قلبی کیفیات ہوتی ہیں ۔ جو انسان کے حصے میں آئی ہیں ۔ اور اسی لئے وہ اپنے اندر آفاقیت رکھتی ہے ۔

غزل عشق و حسن کی باتیں ان کے رموز و اسرار ، اور ان کے ناز و نخرے اور ادائیں اپنے اندر جذب کئے ہوئے ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ امتداد زمانے کے ساتھ اس کے دامن میں کشادگی اور وسعت پیدا ہوتی چلی گئی ۔ اور اس کے جمالیاتی پہلو نکھر کر ابھرتے چلے گئے ۔ اور مواد و موضوع کے لحاظ سے رنگا رنگی پیدا ہو گئی ۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود غزل کی ایک روایت ہے

جسے سینے سے لگائے صدیوں اور صدیوں سے یہ بڑھتی چلی آرہی ہے اور بڑھتی ہی چلی جائے گی ——— یہ روایت کوئی بھی اس کے سینے سے کھینچ کر جدا نہیں کر سکتا۔ غالب کے الفاظ ہیں

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر!

غزل میں جربات بھی کہی جائے وہ "بادہ و ساغر" اور "دشنہ و خنجر" کی آڑ سے کہی جاتی ہے۔

غزل بھی دوسری اصناف کی طرح فارسی سے اُردو میں آئی ہے۔ غزل ایران میں آنے سے قبل، عربوں کے یہاں قصیدے میں رچی بسی ہوتی تھی۔ ایرانیوں نے عربوں کے قصیدے سے یہ رنگ نچوڑ کر اسے غزل کا روپ بخشا اور اس طرح اس صنف کو ایران میں ایک مستقل حیثیت حاصل ہو گئی ——— پھر ایرانی اسے ہندوستان لے آئے ——— اور ہندوستان کی سرزمین اور ماحول اسے ایسا بھایا کہ یہ یہیں کی ہو کر رہ گئی ——— ہمالیہ کی طرف سے بہنے والی خنک ہواؤں اور دکن کے دھان اور ناریل کی خوشبوؤں نے اس میں ایسی تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو رعنائیاں بھریں کہ یہ دوسری اصناف میں شہزادی بن کر مسکرانے لگی۔

جنوبی ہند کے باسیوں نے دل کی شہنائیاں بجا بجا کر اس میں شعر و نغمہ کی رُوح کو جگایا، آنکھیں موند موند کر، جذبات کی حدت سے اس کی موہنی پیشانی کو صیقل کیا ——— اس کے جمالیاتی نظام کی تحریم میں اضطراب ظاہر کیا۔

انہوں نے پیار اور ربیت کا جو مقدس مُکٹ اس کے ماتھے پر سجایا تھا۔

وہ آج بھی دمک رہا ہے اور آنے والے دنوں میں بھی یونہی جگمگاتا رہے گا۔

غزل کی نشوونما اور ترویج میں ہمارے تہذیبی، تمدّنی اور معاشرتی ماحول کا دخل رہا ہے —— انھی چیزوں کی معاونت سے اس کی جمالیاتی قدریں ابھریں اور ذہنی میلانات اور رجحانات تشکیل پانے لگے —— ہندوستان کے جذباتی لوگوں نے اپنے دِل کی آنچ اور ذہن کی حدّت اسے سونپ دی اور اس طرح اسے "دو آتشہ" بنادیا —— جس طرح سورج کی کرنیں پٹ سن کے نرم ریشوں میں سنہری رنگ بھر دیتی ہیں۔ اسی طرح دلوں کی تمازت نے غزل کے حسن میں شہابی ساتے بھر دیتے۔

غزل کے لئے داخلیت، احساس و جذبات کی شدت، سوز و گداز اور رعنائیت لازمی ہے۔ اختصار۔ ایجاز اجمال اور ایمائیت اس کی جان ہیں، یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ میں جب داخلیت کی جگہ خارجیت، شدتِ جذبہ کی بجائے تصنع بناوٹ اور اختصار و اجمال کی بجائے بے جا بناؤ سنگار نے لے لی تو اس کی آنکھوں کی سرخی پیشانی کی دمک اور حسن کی جوت گھٹ کر رہ گئی۔

ایک دھان پان سی دوشیزہ جس کے کومل تن پر مہین سا لباس بھی گراں گزرتا ہو، بھاری زرہ میں کیسے شگفتہ رہ سکتی تھی —— لکھنؤ نے اپنی نازک مزاجی کے باوجود اس صنفِ نازک و لطیف پر فولادی ملبوس چڑھا دیا جس سے اس کا بھل اور شعلہ آسا حسن دب کر رہ گیا۔

غزل کو اس کا اصلی روپ اور وہ تمام عنصر جن سے یہ شعلہ آسا بنتی ہے مل جائیں تو یہ دِل و روح کو جلائے بغیر نہیں رہتی — اور پھر اس کے نتیجے میں احساسِ جمال اور ذوقِ جمال کی تسکین ہوتی ہے۔ اور انسان کو ایک آسودگی، ایک سکون، ایک دھیرج اور ایک سپھلتا ملتی ہے۔

مشرق کی یہ خلوص زاد بیٹی لالہ کے پھولوں کی سُرخی، نقرئی چاندنی کا نکھار، رنگین پانیوں کی ملکیت اور جوہی کی ڈال کی مانند لچکتا پیکر لے کر شمالی ہند پہنچی تو بہاریں اس کے حضور میں جھک گئیں ——— اور پھر یہ نوبہار بن گئی۔

کنول کا دلکش پھول، پتیوں کے ایک سلیقے اور حُسنِ انتخاب کا نام ہے۔ اگر ان پتیوں میں سے کوئی ایک بھی کم ہو جائے تو حسن میں ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی حال غزل کا ہے، صورت، ہیئت، مواد، موضوع کے علاوہ اگر حُسن الفاظ، قافیہ، ردیف، مطلع مقطع اور فکر میں سے کسی ایک کی بھی کمی ہو جاتے تو غزل کا حسن چٹخ جاتا ہے۔

غزل کی شاعری بہت بلند اور مشکل قسم کی شاعری ہے۔ اس میں طبع آزمائی کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں اور یہی وجہ ہے کہ بہت سے شاعر غزل کہتے کہتے آپ ہی معدوم ہو کر رہ گئے ——— اور اپنی جگہ سے ابھرے تک نہیں۔

غزل میں عموماً واردات قلبی کا بیان ہوتا ہے۔ دل کی بات اپنی جگہ سے اُٹھ کر غزل میں سما جاتی ہے۔ دل کے محل کو چھوڑ کر غزل کے گھونگھٹ میں چھپ جاتی ہے۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے (غالب)

غزل انسانی جذبات و احساسات کی تصویریں پیش کرتی ہے۔ انسان مختلف اوقات میں مختلف قسم کے خیالات کو جنم دیتا ہے اور پھر انہیں غزل کے سپرد کر دیتا ہے۔ اور اس طرح غزل کے ہر شعر میں ایک نیا مضمون باندھا جاتا ہے۔

بقول شیلے " ہمارے شیریں، دلکش اور رسیلے نغمے وہی ہوتے ہیں جن میں رنج و الم کے خیالات کا بیان ہو۔"

مارک آمذرے کہتا ہے" شاعری رنج وغم کی ماں جاتی ہے۔ ہر وہ شخص جو غم اٹھتا۔۔۔۔۔۔۔ اور تکلیفیں سہتا ہے شاعر ہے ——— ہر آنسو ایک شعر ہے، اور ہر دل ایک نظم ———"

علامہ اقبال کے الفاظ ہیں ؎

غم نہیں غم روح کا اک نغمۂ خاموش ہے
جو سرود بربط ہستی سے ہم آغوش ہے

یہ دنیا غمکدہ ہے۔ دکھ ہر انسان کے ہر حصے میں آتے ہیں اور زندگی میں ان سے انسان کا واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ اور اسی لئے اس قسم کے اشعار اسے بھلے لگتے ہیں۔ اور یہ اس کے زخم کے اندمال کا کام کرتے ہیں ——— اور اسے ان میں سکون ملتا ہے ——— غزل ان خیالات کے لئے بالکل مناسب اور موزوں ہے۔ لیکن پھر بھی شاعر کو ایک ہی قسم کے مضامین نہیں باندھنے چاہئیں۔ کیوں کہ انسانی فطرت تنوع چاہتی ہے۔

غزل کا ایک ایک شعر تراشا ہوا نگینہ ہے اور اس کا اختصار، توازن اور نغمہ انگیزی بذاتِ خود ایک فن ہے اور فن بھی ایسا جو لطیف، نفیس اور سبک ہے شعر پڑھتے ہی شعر کی لطافت ذہن میں آجاتی ہے اور چوں کہ ایک ہی شعر میں پورا مضمون مستور ہے اس لئے ذہن تشنہ نہیں رہتا اور ذوق کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں۔

کئی سو سال پرانی روایات آج بھی صنفِ غزل کا سب سے بڑا سرمایہ ہے غزل نے متنوع اور رنگا رنگ عشقیہ کیفیات کو اپنی آغوش میں جذب کر کے ان جذباتی تقاضوں کو پورا کیا ہے جو کسی صنف ادب سے پورے نہ ہوئے۔ ولی، میر درد، غالب، مصحفی اور مومن نے جن کیفیات کو پیش کیا وہ آج بھی ہماری کیفیات معلوم ہوتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کیفیات میں رنگ جدا جدا ملتے ہیں۔ کیوں کہ ہر شاعر۔۔۔۔۔

اپنے کلام میں اپنی شخصیت کا عکس بھی رکھتا ہے —— اور یہی وجہ ہے کہ سودا میر اور درد ایک زمانے میں ہونے کے باوجود اپنا اپنا ایک مخصوص رنگ رکھتے ہیں۔

غزل کی سب سے بڑی خوبی اس کا لوچ ہے۔ ہر قسم کے خیالات اس میں بآسانی سما سکتے ہیں غزل کی تاریخ پر اگر نگاہ ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ غزل کا سینہ کس قدر نرم ہے۔ اور یہ بات اپنے اندر جذب کر سکتی ہے۔ دکنی دور سے حسن وعشق کے معاملات چلے اور پھر ہر شخص اپنے فکر اور ذوق کے مطابق ان میں اضافہ کرتا چلا گیا۔ اور اشاروں اشاروں میں بہت کچھ کہہ گیا —— جسے ہم "ایمائیت" کہہ سکتے ہیں۔

صرف یہ کہہ دینا کہ غزل بلبل وگل، چاند و چکور، شمع و پروانہ اور شبنم و پھول کے چونچلے ہیں —— صحیح نہیں —— غزل سماج کا عکس ہے۔ —— معاشرے کا پرتو ہے —— اذہان اور دلوں کی پرچھائیں ہے —— فلسفہ کا لہو ہے —— تخیل کا نچوڑ ہے ——

روح کی پکار ہے۔ فکر نے جو پہلو بدلا وہ اس میں آ گیا اور شاعر نے "پیمانۂ دنیا" کی گت پر نغمہ گنگنا دیا۔

غزل ہمیشہ اپنی ارتقائی منزلوں سے گزری ہے اور آئندہ بھی گزرتی چلی جائے گی —— ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آج کا دور غزل کے انتہائی عروج کا دور ہے —— یا غزل موجودہ مقام سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ غزل کی بہتی دھارا کو وقت کی چٹانوں سے نہیں روکا جا سکتا۔ دن بدن اس کا قدم آگے ہی اٹھتا جا رہا ہے غزل کی دوشیزہ، ہرجائی ہے۔ کسی ایک عاشق صادق کا دل نہیں لبھاتی۔ پل بھر کے لئے ٹھہری اور پھر رقص کناں، ادائیں بکھیرتی آگے بڑھ گئی —— آج یہ زمین پر ہے۔ کل یہ چاند میں ہوگی، اور پھر کہیں اور —— غرضیکہ جوں جوں ہماری یہ دنیا نئی چیزوں سے روشناس ہوگی۔ وہی نئی چیزیں

نئے موضوع کے موتی بن کر غزل کے لباس میں ٹکتے جائیں گے۔

کبھی اُردو غزل کا اولین شاعر ولی دکنی تسلیم کیا جاتا تھا۔ پھر نئی تحقیق اور جستجو کے سبب محمد قلی قطب شاہ کو یہ سعادت حاصل ہوئی۔ اور وہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر مانا گیا —— لیکن اب ہماری معلومات میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے اور اُردو غزل پیچھے ہٹ کر بہمنیوں کے دور میں جا پہنچی ہے —— جو معاصر ہمارے سامنے ہیں۔ ان سے یہ بات اچھی طرح واضح اور ثابت ہو گئی ہے کہ غزل کی صنف کا آغاز آج سے قریباً پانچ سو سال قبل یعنی ولی سے قریباً دو سو سال اور محمد قلی قطب شاہ سے سو، سوا سو سال پہلے ہو چکا تھا

بہمنیوں (۱۳۵۰۔ ۱۵۲۵ء) نے دکن میں اپنی سلطنت قائم کر کے اُردو کی بے حد خدمت کی ہے —— اس خاندان کے حکمرانوں میں فیروز شاہ بہمنی کا علم وفضل اور شعر و سخن کی نشوونما اور پرورش میں اتنا ہی حصہ ہے جتنا کہ بعد کے زمانے میں محمد قلی قطب شاہ اور ابراہیم عادل شاہ ثانی نے سخن گستری اور ادب پروری میں حصہ لیا —— اسی عہد سے ہمیں اُردو کی نثر و نظم کا پتہ چلتا ہے۔ اس علم پرور بادشاہ کا پایہ تخت گلبرگہ، دکن میں اُردو کا اولین گہوارہ تھا —— دوسری اصناف سخن کے علاوہ اردو ادب میں غزل کی تخلیق بھی اسی خاندان کی رہینِ منت ہے۔ غزل کا سب سے پہلا شاعر مشتاق، سلطان محمد شاہ لشکری بہمنی (متوفی ۱۴۸۲ء) کے دور میں ہوا تھا۔

اردو کے ابتدائی دور میں دکنی شعرا کی جتنی بھی غزلیں ملتی ہیں وہ مشتاق۔ لطفی شہباز حسینی (بہمنی عہد ۱۳۵۰۔ ۱۵۲۵ء) مرزا دولت شاہ ظہوری جن کمال خان رستمی۔ ملک خوشنود۔ محمد عادل شاہ۔ نصرتی۔ ہاشمی۔ حسینی۔ قادر (عادل شاہی عہد ۱۴۹۰۔ ۱۶۸۶ء) محمد قلی قطب شاہ۔ وجہی۔ غواصی۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ،

تاناشاہ (قطب شاہی عہد ۱۵۰۸ء ۱۶۸۶ء) عشرتی، آزاد، وجدی، فراقی اور پھر ولی، داؤد، خاکی، عاصی، ناصر، عاجز، اور سراج (دورِ انتشار اور مغل عہد ۱۶۸۶ء ۱۷۵۰ء) کی آغوشِ محبت میں پلی اور پروان چڑھی ہیں۔ ان تمام دور میں گلبرگہ، بیدر، بیجاپور، گولکنڈہ، حیدرآباد اور اورنگ آباد شعر و ادب کے بڑے مرکز رہے ہیں اس وقت غزل کا جو عام رنگ تھا اس کا اندازہ ان غزل گو شعرا کی نگارشات سے بخوبی مترشح ہے —— یہ الگ بات ہے کہ اس انداز میں کہیں کہیں ہلکی پھلکی ردّوبدل ہوتی رہی ہے۔

مغلوں سے پہلے دکن کی غزلوں میں فارسی انداز کم ہے —— اور مقامی رنگ میں ان کا انگ انگ ڈوبا ہوا ہے —— ہندی شاعری اور اس زبان کے نامانوس الفاظ کے گہرے پرتو ان غزلوں میں رچے ہوئے ہیں —— مغل دور کے ساتھ غزل ایک نئی کروٹ لیتی ہے۔ اور اس میں گوناگوں اضافے ہوتے ہیں۔ وقت کے بہاؤ کے ساتھ کس قسم کا تغیر، غزل کے حصے میں آیا، اس کا اندازہ ان شاعروں کی غزلوں کو دیکھ کر بخوبی لگایا جا سکتا ہے —— اب ہم یکے بعد دیگرے دکنی غزل گو شعرا کی کاوشوں کا جائزہ لیتے ہیں، تاکہ سخنوری کی بوقلمونیاں اور نیرنگیاں ہماری نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہو جائیں۔

مُشتاق جو اس وقت پہلا غزل گو تسلیم کیا گیا ہے استادِ سخن سمجھا جاتا ہے —— انھوں نے نہ صرف غزلیں لکھی ہیں، بلکہ قصیدے بھی کہے ہیں —— ان کی غزلوں سے اس زمانے کی غزل گوئی کے پیکر، اس کی آن بان اور روح کا جائزہ لیا جا سکتا ہے —— ان کی غزل میں ہندی رچاؤ ہے اور حسن و عشق کے معاملات کا بیان ہے —— جو روانی اور ترنم سے معمور ہے۔

نمونۂ غزل

تجھے دیکھتے دل تو گیا ہور ہیو اُپر بے کل گھڑی
دیکھے تو ہے جیو کے اوپر نین دیکھے تو نین کل گھڑی

سُورج کے گل میں چاند جیوں یوں تجھ گلے ہیکل دسے
قربان اسکے ہات پر جن اے تری ہیکل گھڑی

آبِ حیات او لب ترے جاں بخش وجاں پرور اہے
مشتاق بوسے سوں پیا امرت بھر او کل گھڑی

او کسوت کیسری کرتن چمن میا نے چل ہے آ!
رہے کھلنے کوں یوں دستی او چلنے کی کل ہے آ

سُورج مرجان میں جیوں دستا نظر دوں کانپتی تھر تھر
جو لٹ پیچاں بھری سر تھے او رُخ اوپر ڈھل ہے آ

سورج کی تاب سیتے جوں پگلتا برف آپس میں
او رُخ دیکھت نظر انکھیاں میں گل ہے آ۔

لطفی، مشتاق کا ہمعصر ہے اور بیدر کا شاعر ہے۔ ان کی غزلیں اور قصیدے بھی موجود ہیں،

نمونۂ غزل

خلوت میں بن کے یں موم کی بتی ہوں
یک پاؤں پر کھڑی ہوں چلنے پرت پتی ہوں
سب نس گھڑی جنوںگی جاگہ سوں نہ ہلونگی

نا جیل کو کیا کروں گی اول سوں مدمتی ہوں
دسیا چتور رسیلے بھوگی سو شہ محمد
مندر منے سجن کے بن جاگتی رہتی ہوں
تغلقی ترے چلن کی پاکی کہاں ہے اس میں
جیوں پانچ پانڈواں کے کینے مود ھرتی ہوں

تغلقی کے بعد بہمنیوں کے ہاں تیسرے غزل گو شاعر سید شہباز حسینی ہیں جو خواجہ بندہ نواز کی اولاد میں سے تھے۔ بیجا پور میں فوت ہوئے اور محمد شاہ پٹنہ میں دفن ہوئے۔

نمونہ غزل

سونے نہ دوں خلق کوں شہباز نس دن روتے کر
سوتے سنے پر کوں مرے مت کوئی دیکھے سوتے کر
جس رات شہ سوں نا ملوں اس باج جیوں میں تلملوں
آپ آہ کی آگ میں جلوں آپس بوجاون روئے کر
شہباز دوجا نام نیئں جب جیو اُپرے آؤں میں؟
آر سے بے سرتا پاؤں لگ آپس چراؤں روئے کر

اس کے بعد عادل شاہیوں کا دور آتا ہے۔ عادل شاہیوں نے بھی اردو کی خدمت کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے ــــ اور بیجا پور علم و ادب کا سرچشمہ بنا رہا ہے ــــ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس سلطنت کا بانی یوسف عادل شاہ (۱۴۹۰ء ۱۵۱۸ء) خود علم و فضل کا بڑا دلدادہ تھا۔ فارسی میں شعر کہتا تھا ــــ کلام موجود ہے اور شائع ہو چکا ہے۔ اسی خاندان کا ایک اور بادشاہ ابراہیم عادل شاہ

ثانی (۱۵۸۰۔ ۱۶۲۲ء) جو گولکنڈہ کے محمد قلی قطب شاہ کا ہمعصر تھا۔ علم دوست بادشاہ تھا۔ جب مغلوں کے ہاتھوں گجرات اور احمد نگر تباہی اور زوال سے ہمکنار ہو لے گئے تو اس صاحب ذوق بادشاہ نے باکمال اور صاحب فن ہستیوں کو بیجاپور چلے آنے کی دعوت دی —— اور اپنی بخششوں اور فیاضیوں سے بیجاپور کو علم و فنون کی تاریخ میں زندہ جاوید بنا دیا —— مختلف جگہوں کے علماء اور فضلا اور ارباب سخن کی آمد نے اس شہر کی فضاؤں میں اس قدر جگمگاہٹیں بھر دیں کہ ان کی آب و تاب ایک صدی تک ماند نہ پڑی۔ اس دور کی غزل گوئی میں اوّلیت کا شرف مرزا دولت شاہ کو حاصل رہا ہے۔ دولت شاہ مقیمی کے ہمعصر ہیں۔ جنہوں نے ۱۶۳۸ء میں عشقیہ اردو مثنوی چندر بدن و مہیار لکھی تھی —— مرزا دولت شاہ کی غزل سے پہلے، بیجاپور کی عشقیہ غزلیں نہیں ملی ہیں۔ ان کی عشقیہ غزل کا انداز یہ تھا۔

لذت لذیذ ترل صورت جمال جلوا
گوری کا رنگ لب ہے بجو کا او لال حلوا
شرفی فروش سارے حیراں ہے بچائے
دیکھ شدا پس بسارے تجھ نرم گال حلوا
عاشق کوں موں ہنک کر بولے سو شاہ دولت
تجھ لب تے تُوں ذرا ئے مجھ کوں اتال حلوا

ظہور ابن ظہوری ترشیزی نے بھی اسی دور میں بیجاپور کی اُردو نواز فضا میں، پرورش پائی اور اردو شعر و شاعری کے ذوق میں ڈوب کر غزلیں لکھیں ان کی غزلوں کا انداز یہ ہے۔

جوبن سیف بیچ کر کچ مست ہو چلی ہے

لگر سو پیچیاں ہور گھونگراں کی کھلبلی ہے
دو تین تیرے کر راوت بیلا کریں پرم کا !!
سر کاٹ عاشقاں کا تن سوں جُدا کری ہے
اے شوخ ہات غافل بر ہا کھڑا ہے مشکل !!
بکتل ظہُور سوں مل یو جان دلبری ہے

حسن شوقی بھی اسی دور میں بیجاپور میں شہرت رکھتے تھے — اور یہیں سے بعد میں گولکنڈہ گئے تھے — احمد پور میں انہوں نے مثنوی "فتح نامہ نظام شاہ" لکھکر شہرت پائی — بیجاپور میں بھی انہوں نے "میزبانی نامہ عادل شاہ" کے عنوان سے ایک مثنوی لکھی، جس میں عادل شاہ کی شادی کا تفصیل سے حال درج ہے
حسن شوقی کی غزلیں بھی اعلیٰ پایہ کی ہیں اور دکنی غزلوں کی سی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کی غزلوں کا نمونہ درج ذیل ہے۔

تجھ مکھ کنول کو لے بدل جگ میں سرنگ لالہ ہوا
تجھ زُلف سے اپچا بھور دوجا بھونگ کالہ ہوا !
تجھ نین تے نرگس کھلے جبھر کھلے بن کر کھلے !!
تجھ خوے تے دونا ہوا مروا ہوا بالا ہوا !
شوقی ہماری برہ کے راساگرں جیو جھبو کا فلک
پاسنگ تس میزان کا گا دیں نر نالا ہوا !

بجنے تجھ برہ پا دکھ میں جہنم کا جنم پکڑے
انو نے حوض کوثر تے کدھیں یک پل نہ نم پکڑے
عجب کیا ہے جو پاوے تو اثر تیرے دہن کا کچھ

نقاؤ توشۂ فنا کا لے اگر راہِ عدم پکڑے !!

ہمارے حال پر شوقی بجز حق کوئی واقف نہیں
کراناً کاتبیں میکس رہے حیراں قلم پکڑے

کمال خان رستمی بھی اسی دور کے شاعر ہیں۔ یہ ٹھیٹ بیجاپوری شاعر تھے اصناف سخن میں کمال پیدا کیا۔ نثر بھی لکھی تھی ــــ ان کے ساتھ ہی ملک خوشنود بھی دکھائی دیتے ہیں

ملک خوشنود دراصل گولکنڈہ کے غلام تھے، خدیجہ سلطان کے جہیز میں بیجاپور بھیجے گئے تھے ــــ خدیجہ سلطان ان کے حسنِ انتظام اور ان کی کارگزاریوں پر اتنی خوش ہوئی کہ بیجاپور میں محل کی خدمت ان کے سپرد کر دی ــــ بیجاپور میں ملک خوشنود کو اس قدر اہمیت حاصل ہوئی کہ ۱۶۳۵ء میں بیجاپور کی طرف سے گولکنڈہ میں بحیثیت سفیر مقرر ہوئے۔

ملک خوشنود نے متعدد قصیدے اور غزلیں بھی لکھی ہیں ــــ امیر خسرو کی فارسی مثنویوں کا بھی اُردو میں ترجمہ کیا۔

محمد عادل شاہ کی وفات کے بعد ان کا لڑکا علی عادل شاہ ثانی (۱۶۵۶ء-۱۶۷۳ء) تخت نشین ہوا ــــ علی عادل شاہ ثانی شاہی تخلص کرتے تھے علم پرور اور اچھے شاعر تھے ان کا مکمل اردو دیوان موجود ہے ــــ جس میں غزلیں قصیدے اور مثنویاں ملتی ہیں ــــ ان کے کلام میں سوز و رعنائی پائی جاتی ہے

ان کی زندگی کا بیشتر حصہ مغلوں کے خلاف رزم آرائیوں میں گزرا ہے۔ چونکہ مضطرب رہے ہیں اس لئے ان کا کلام بھی بے چینیوں سے لبریز ہے ــــ انہوں نے گیت بھی لکھے ہیں، ان کا انداز بھی یہی ہے۔ اور ان سے اضمحلال ہویدا ہے۔

شاہی نے غزل کے جمالیاتی نظام کی تحریم کی ہے۔ اور اپنی فنّی صلاحیتوں سے ان میں ترنّم، بہاؤ اور جذبہ کی شدت کو جگہ دی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی غزلوں میں بھی ہندی کا وہی رچاؤ ہے، جو ہمیں دُوسرے دکنی شعرا کے ہاں دکھائی دیتا ہے۔ لیکن ان میں ان کا کوئی دوش نہیں —— اس زمانے کی ریت بھی یہی تھی —— یہ ایک منہج تھا، جس پر سے سبھی کو گزرنا پڑتا تھا۔

یاقوت اور مرجان کی پرکھ کے بارے میں ان کی یہ غزل، دلچسپیاں لئے ہوئے ہے۔

سارے جہاں کے پارکھی پرکھوں رتن کیوں کر کہو
یاقُوت ہور مرجان میں کو ہے رتن برتر کہو
بولے جہاں کے پارکھی ہمنا نہ آوے بولنا
تقا سُہنا بولنا اے شاہِ بحر و بر کہو
بولیا جوں نت میں فکرتے یوں دو رتن کا فرق کر
گر کچھ اچھے انصاف تو اس بول کوں خوشتر کہو
مرجان میں صافی نہیں یاقوت میں صافی اچھے
جس ذات میں صافی اچھے اس ذات کوں بہتر کہو
یاقوت ہور مرجان کی شاہی لکھیا ساری غزل
سُن کر جگت کے شاعراں اس شعر کوں افسر کہو

ان کے گیتوں کا سوز دیکھئے —— پگھلی ہوئی آگ بھری ہے —— من کی جوالا مکھی نے اپنا منہ کھول دیا ہے۔

گیت کے دو بند ہیں

کوئی جاؤ کہو مجُ ساجن سات   ہیں نیہ بندی توں گیتا گھات

دل میرا اپنے سات کیا
مج برہے میں دن رات کیا
دلداری کا نا ہات کیا
سب بسر سکھ ہیہات کیا
کئی مج سوں ایسا گھات کیا

کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات — میں نیہ بندی توں کیتا گھات

تجھ یاد منیں تلملتی ہوں!
لہو تیل منے دل تلتی ہوں!
تن موم بتی ہو جلتی ہوں
اس جلنے سے نا ٹلتی ہوں
سب رین برہ میں گلتی ہوں

کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات — میں نیہ بندی توں کیتا گھات

علی عادل شاہ شاہی کے دربار (بیجاپور) کے ملک الشعراء ملا نصرتی نے جنہیں قصیدہ گوئی میں بہت اونچا مقام حاصل تھا۔ غزلیں بھی کہی ہیں۔ ان کی غزلوں کے ایک مجموعہ "گلدستۂ عشق" کا ذکر ملتا ہے —— ان کی زبان سادگی اور سلاست کی حامل ہے۔ اور ایک مصوریت سی لئے ہوئے ہے۔

غزل کا نمونہ

کرتا ہے ماہ نو کو سپورن کر آفتاب
تو آرسی کر ہات پکڑ اور کر آفتاب

تجھ حسن کا جھلک جو پڑے زنگبار پر
ہر حاملہ وہاں کی جنے دختر آفتاب

معذور ہے بے خبر ہے مدسوں مدن کی بالی
عالم کے جیو لینے لوچن میں ہے سوالی
اس خام سن میں دیکھو کیا پختگی کے فن ہیں
دینے کو وصل کا پھل لینے کو جیو آتالی
برہے کے بن میں غم سوں جلتا ہوں شمع نمنے
دکھلا ضیا ورس کا اے خاور جمالی

سید میراں شاہ ہاشمی مادر زاد اندھے شاعر تھے۔ انھوں نے مثنویوں اور مرثیوں کے علاوہ ریختی میں ایک پورا دیوان مرتب کیا تھا جو سلسلۂ یوسفیہ کی طرف سے شائع ہو رہا ہے۔ انھوں نے ۱۶۸۷ء میں مثنوی "یوسف زلیخا" کو بھی اردو میں منضبط کیا۔ اس مثنوی کے کئی نسخے موجود ہیں۔

ہاشمی کے یہاں ہندی بھاشا کے اثرات اپنے شباب پر ہیں۔ ان کی غزلوں میں عورت اپنے تمامتر احساسات وجذبات کے ساتھ چھپی بیٹھی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے عورت گھل کر غزل بن گئی ہے۔ ہاشمی کی غزلیں عورتوں کے مختلف جذبات واحساسات کی غمازی کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود ہم ان کو رنگینؔ اور انشاؔ کی ریختی کا درجہ نہیں دے سکتے۔ ہاشمی کا یہ انداز کسی ہوس کا پرتو نہیں۔ یہ تو ان ہندی اثرات کا ردِ عمل ہے —— جو دکن کی فضاؤں میں ستارے بن کر جھلملا رہے تھے۔

اوروں کی نسبت ہاشمی کی غزلیں، سادگی اور سلاست کے زیادہ قریب ہیں الفاظ بھی سیلے، زیادہ دھلے ہوئے اور شفاف ہیں۔ بعض جگہ تو ان میں معصومیت بھولے پن اور خلوص کی کلیاں تبسّم کناں دکھائی دیتی ہیں۔ بھولے پن اور معصومیت کی بے ساختگی، ان کی غزلوں کی آن بان ہے۔ اور ان میں شعریت

ناقابلِ فراموش حد تک رچی ہوئی ہے اور یہ سب کچھ ان کے فن کی ایک خوبی ہے۔ دیکھئے ایک عورت، جذبۂ دل کا سہارا لے کر کتنی معصومیت کے ساتھ غزل کی آغوش میں سمٹ آتی ہے۔

سجن آویں تو پردے سے نکل کر بھار بیٹھوں گی
بہانہ کر کے موتیاں کا پروتی ہار بیٹھوں گی
انو یہاں آ کو کہیں گے تو کہوں گی کام کرتی ہوں
اٹھلتی ہور مٹھلتی چپ گھڑی دو چار بیٹھوں گی
نزک نیں ان کے جانے کو خوشی سوں شاد ہوں دلیں
ولے لوگاں میں دکھلانے کوں ہو بیزار بیٹھوں گی
بلایاں جیو کالے میں پڑوں گی پاؤں دل سوں میں؛
ولے ظاہر میں دکھلانے کوں ہو اغیار بیٹھوں گی
کروں گی ظاہرا چپ میں غصہ ہور مان ہٹ لیکن
سر سجن پر تے جیو اپنا یہ جیو میں وار بیٹھوں گی
کنے کو چپ کتی ہوں میں ڈولے میں ولیں گھٹ کی بول
نزک ہو ہاشمی سوں مل کو آٹھوں پہار بیٹھوں گی

حسینی اور قادر بھی اس دور کے غزل گو ہیں —— حسینی کا دیوان موجود ہے اور غزل کا نمونہ یہ ہے۔

تمہارے دید کا لذت ہمارے آنز سوں پوچھو
ہور اپنے حسن کی خوبی یو چشم ناز سوں پوچھو
سینے سے کھینچ کر سینہ لگا لے شوق سوں پیارے
اور راحت ہور خوشی جی کی اسی جان باز سوں پوچھو

جیسنی منتظر بیٹھا ہے لب سوں چاند سوں لکھ کا
اگر ہو دل منے پیالے تو پھر کیوں راز سوں پوچھو

اس کے بعد یہ دور ختم ہوتا ہے اور قطب شاہی عہد کا آغاز ہوتا ہے۔
بہمنی بادشاہوں کے جانشینوں میں شاہان قطبیہ کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ ان کی بے پناہ کاوشوں اور ادب نوازیوں سے، اردو ادب میں اور بھی شگفتگی اور تازگی درآئی۔ ان کی ادب پروری اردو تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گی —— گولکنڈہ کے ذرہ ذرہ سے ان کی ادبی خدمات کی ابھی بو آتی ہے —— اس دور کے غزل گو شعرا میں محمد قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، سلطان عبداللہ قطب شاہ، اور تانا شاہ پیش پیش ہیں۔ ابراہیم قطب شاہ کا ہونہار فرزند محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ - ۱۶۱۱ء) علم و ادب پر پروانہ وار نثار ہوتا جاتا تھا —— سلطان محمد قلی قطب شاہ نے جو اردو کے علاوہ فارسی اور تلنگی زبان میں بھی شعر کہتے تھے۔ ان کا اردو کلام پچاس ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔ لیکن یہ پورا کلام اب محفوظ نہیں ہے —— تلنگی کے مجموعہ کا تو پتہ ہی نہ چل سکا —— البتہ کلام الملوک (سلسلۂ یوسفیہ) میں ان کا فارسی کلام چھپ چکا ہے —— اردو کلیات بھی جو بارہ سو صفحات پر مبنی ہے۔ شائع ہو چکا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے دیوان میں غزلیں، قصیدے، مثنویاں، رباعیاں غرضیکہ اصناف سخن کے وافر نمونے موجود ہیں —— ان کی غزلوں میں بھی فارسی اثرات کم اور مقامی رنگ کا گہرا رچاؤ ہے —— لیکن پھر بھی سادگی اور لطافت میں حافظ شیرازی کی غزلوں سے مشابہت رکھتی ہیں۔
انہوں نے حسن و عشق کے موضوعات کو خصوصیت کے ساتھ شعر و سخن کے سانچے میں ڈھالا ہے

محمد قلی ابتدا میں معانی تخلص کرتا تھا۔ لیکن بعد میں قطب شاہ اختیار کر لیا ہے۔

نمونۂ کلام

گرجا ہے میگھ سر تھے تازہ ہوا ئے بستاں
پھولوں کی باس پایا بُلبُل ہزار دستاں
اے خوش خبر صبا توں لے جا جواں قداں کن
چماں کے آرزو میں بیٹھے ہیں مے پرستاں
او نونہال پھولاں ہے جام خو ئے سو بارہ
نرگس اپس پلک سوں جھاڑ و کرے شبستاں
مکھ نور پر دسے یوں مج خط عنبریں او
جوں شور اپر ہے بادل ریحان سوں گلستاں
بے ہوش ہیکر دل کوں مٹھے ادھر جلا ئے
گلزار ہے عجب اور وو لعل شکرستاں؛
مج عشق کے گداگوں اور نگ شاہی دُنیا
سب عاشق منج انگھے ہیں طفل جوں دبستاں
وونی ہوا قطب شہ تج عشق کا پیالہ؛
بھرتے ہیں ہر طرف تو جسم شوق کے خمستاں

منج عشق کری آگ کا یک چنگی ہے سورج
اس آگ کے شعلے کا دھواں سات گگن ہے

توں نین قصہ سن کے معانی بھرا ہے مست
اب نبیھ کے ترازو میں رکھ کر توں اس کو سنج

پیا باج پیالا پیا جائے نا | پیا باج یک پل جیا جائے نا
کہے تھے پیا بن صبوری کروں | کہا جائے اما کیا جائے نا
نہیں عشق بس وہ بڑا کوڑ ہے | کدھیں اس سے مل بیسیا جائے نا
قطب شہ نہ دے مج دوانے کو پند | دوانے کوں کچ پند دیا جائے نا

پیار کی یاد سوں پیتا ہوں میں مے | ہمارا حال کیا جانیں گے شکھ زار

ساقیا آ شراب ناب کہاں | چند کے پیالے میں آفتاب کہاں
نیند کی ہے خماری نیناں میں | او کنول مکھ دھوین گلاب کہاں
پڑدے میں کیوں چھپے گا او جھل کان | سورج کے نور اوپر نقاب کہاں

اور نازک قد جب ڈولتا ہے، | تو چمپاں کے پھول سا لئے ایں

محمد علی قطب شاہ کی غزلوں میں فارسی اثرات کہیں کہیں اجاگر ہو جاتے ہیں —— لیکن مجموعی طور پر ہندی کی گہری گھٹائیں ان پر برستی ہوئی دکھائی دیتی ہیں —— ان کا مرتبہ غزل گو شعرا میں کوئی بہت بڑا نہیں لیکن پھر بھی ان کی غزلوں کو سامنے رکھ کر، ہم اس دور کے عام انداز کا جائزہ لے سکتے ہیں۔

وجہی بھی اسی دور کا شاعر ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے مقابلے میں اس کی

غزلوں میں ہندی اثرات اور زیادہ گہرے ہو جاتے ہیں ——— ان کی غزلوں میں عشق کا اظہار عورت کی طرف سے کیا ہے۔ ان باتوں سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے اشعار میں وہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ جو عام طور پر ہندی بھاشا کی شاعری میں پائی جاتی ہیں ——— لیکن اس چیز کو ہم خاص ان کی ذات سے منسوب نہیں کر سکتے ——— وہ مجبور تھے ——— کیونکہ یہ بھی اس زمانے کا ایک انداز تھا۔ وجہی کا اردو کلیات ابھی تک دستیاب نہیں ہوا ہے البتہ فارسی دیوان موجود ہے۔

نمونہ کلام

طاقت نہیں دوری کی اب تو بیگی آمل رے پیا
تج بن منجے جینا بھوت ہوتا ہے مشکل رے پیا
ہر دم توں یاد آتا منجے اب عیش نہیں بھاتا منجے
برہا یوں ستاتا منجے تج باج تل تل رے پیا!

وجہی گولکنڈہ کے پہلے ملک الشعراء تھے۔

قطب شاہیوں (سلطان محمد قطب شاہ ۱۶۱۱-۱۶۲۵ء) کے دور کے اردو شاعروں میں غواصی بھی بہت مشہور ہوئے ہیں ——— ان کے کلیات میں جو ابھی غیر مطبوعہ ہے بعض غزلیں محمد قلی کی غزلوں کی زمینوں میں ہیں۔ غواصی کی مشہور مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال (۱۶۲۴ء) سلطان محمد قطب شاہ کے آخر عہد میں لکھی گئی تھی۔

غواصی کے بعد ہمیں اس دور کے غزل گو شعرا کی فہرست میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کا نام دکھائی دیتا ہے۔ عبداللہ قطب شاہ اردو اور فارسی کے ایک

اچھے شاعر تھے۔ موسیقی سے والہانہ لگاؤ تھا —— ان کا اردو دیوان موجود ہے اور شائع ہو چکا ہے —— ان کے کلام میں گہرائی اور وسعت نہیں لیکن زبان زیادہ صاف ہو گئی ہے۔ انہوں نے بسنت اور نوروز پر جو غزلیں لکھی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے

بسنت آیا پھلیا پھول لالہ　　　سکھی لیا اب صراحی ہور پیالہ
چمن میانے پھیلا ہے پھول رنگ رنگ　　　نپٹ نازک اچھے رتے اکالا
لڑاں جھاڑاں کی پیڑاں میانے بھریاں　　　جھڑی پکڑے ہیں پانی کا جو لالا
ہوا مدپینے کا آیا ہے پیارے　　　تو مدپینے کو من کرتا ہے لالا

عبداللہ قطب شاہ کے آخری زمانے میں اورنگ زیب کے حملے کی وجہ سے قطب شاہی سلطنت رو بہ زوال ہوتی ہے۔ عبداللہ قطب شاہ کے انتقال کے بعد اس دور انتشار میں، عبداللہ قطب شاہ کا داماد ابو الحسن قطب شاہ کے لقب سے حیدر آباد کا بادشاہ بنا اور پندرہ سال شان و شکوہ سے حکومت کی۔ اہل حیدر آباد انہیں تانا شاہ کہتے تھے۔

تانا شاہ نے بہت سے فارسی اور اردو ادیبوں اور شاعروں کی سرپرستی کی۔ وہ خود بھی اردو کے اچھے شاعر تھے —— چونکہ ان کے عہد میں حیدر آباد مغل فوجوں کی یلغار سے زوال کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ اس لئے اس بربادی کی وجہ سے ان کا دیوان بھی محفوظ نہ رہ سکا —— ان کی یہ غزل بطور نمونہ پیش کی جاتی ہے۔ ——

اے سرو گلبدن تو ذرا ٹک چمن میں آ
جیوں گل شگفتہ ہو تو مری انجمن میں آ
کب لگ رہے گا جیوں لب تصویر بے سخن
اے شوخ خود پسند توں ٹک بھی سخن میں آ

چاہتا ہوں وصف قد میں کروں فکر شعر کی
اے معنیٔ بلند شتابی سوں من میں آ!

اے جانِ بوالحسن توں اچھے خوش لٹک ستے
بند قبا کوں کھول کے صحن چمن میں آ!

اس غزل سے یہ بات عیاں ہے کہ اس زمانے میں زبان پر سے ہندی کے اثرات کا فشار کم ہو گیا تھا —— سادگی ورائی تھی —— غزل "فارسیت" کے رنگ اپنا رہی تھی —— روانی اور تخیل کی رعنائیاں جمیل سے جمیل تر ہوتی جا رہی تھیں۔

یہاں سے اب دکن میں مغل دور (۱۶۸۶ء - ۱۷۵۰ء) کا آغاز ہوتا ہے اور غزل میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں —— اس زمانے میں جنوبی ہند کو مغل اپنے تصرف میں لے آئے ہیں۔ اور ان کی آمد کے ساتھ ہی فارسی غزل اور اس کی روایات بھی سرزمین دکن میں داخل ہو جاتی ہیں اس لئے ان کا ردِ عمل، دکن کی آغوش میں پرورش پانے والی غزل پر بھی ہوتا ہے —— فارسی روایات کے سامنے دکن کا عام انداز اور اس کی انفرادیت ماند پڑ گئی اور پھر محو ہو گئی اور اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے شعر و سخن کا مذاق اور انداز بدل گیا —— اور فارسیت نے ہندی فکر اور ہندی اثرات پر غلبہ پایا۔

غزل کی روایات قائم ہوئیں غزل سادہ تر بن گئی —— اور پھر اس سادگی نے حسن و جمال سے غزل کی جھولیاں بھر دیں —— اس وقت اورنگ آباد، کے کلس پر علوم و فنون کا مہتاب ضیا پاشیاں کر رہا تھا۔

اس زمانے کے غزل گو شعرا کی ترتیب یوں دی جا سکتی ہے۔

عشرتی۔ آزاد، وجدی۔ فراقی۔ ولی۔ داؤد۔ خاکی۔ عاصی۔ ناصر۔ عاجز اور

سراج ـــــ ان شعرا میں. فراقی. ولی اور سراج کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے ـــــ ولی دکنی غزل گو شعرا کے سرتاج ہیں۔

عشرتی نے اردو دیوان غزلیات کے علاوہ دو مثنویاں "دیپک پتنگ" اور "چت لگن" بھی لکھی تھیں۔

فقیر اللہ آزاد خاص حیدرآباد کے باشندے تھے اور اردو کے بہت ہی اچھے شاعر تھے ـــــ ان کا ذکر میر حسن نے "تذکرہ" میں بھی کیا ہے۔ ولی اورنگ آبادی نے ان کی ستائش کی ہے اور ان کی غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں ـــــ ولی ایک جگہ کہتے ہیں۔

آزاد سے بنیا ہوں یہ مصرعہ مناسب
جس سے کہ یار تھا ایسا ہنر نہ آیا

وجیہ الدین وجدی بھی اس دور کے بڑے شاعروں میں سے ہیں ـــــ ان کی تین مثنویاں "پنچھی باچھا" "تحفۂ عاشقاں" اور "مخزن عشق" موجود ہیں ـــــ ان کی زبان ترقی یافتہ اور سادہ ہے ـــــ انہوں نے غزلیں بھی لکھی ہیں ـــــ غزل کے اشعار۔

پچھلی کا آج بچھڑا مجھ اُپر بھاری ہوا یاراں
تو ہیں اس دو جگت سینتی نرا دھاری ہوا یاراں
ہماری بُت پرستی کون نہیں بوجھے اجھوں زاہد
برائے کفر سب دیں کو تو پوجاری ہوا یاراں !!
نکو کہہ وجدیا اپنیاں نیٹ سب وصل کیا تاباں
کہتے ہیں لوگ سب تجھ کو کہ زناری ہوا یاراں !

سید محمد فراقی بیجاپوری شاعر تھے۔ زوال بیجاپور کے بعد چلے اورنگ آباد

آئے اور آزاد کے ساتھ دلی کا سفر کیا، اور وہاں اتنی شہرت پائی کہ وہاں کے تذکرہ نگاروں نے ان کا خاص طور پر ذکر کیا۔ غزل گو کی حیثیت سے انہیں بہت ہی مقبولیت حاصل ہوئی۔

نعتیہ غزل کے چند اشعار

مدینے میں اگر پیدا ہوا ہوتا تو کیا ہوتا — محمد کی گلی بھیتر فنا ہوتا تو کیا ہوتا
ازل کی دین ہیں یا رب اگر مفلس بھکاری ہوں — نبی کے آستانے کا گدا ہوتا تو کیا ہوتا

نظر ہے علم منطق ہور معانی میں فراقی کوں
اگر علم حدیث مصطفےٰ ہوتا تو کیا ہوتا

ولی چوں کہ ایک انفرادی شان رکھتے ہیں، اور ایسے منہاج کے بانی ہیں جس کی پیروی آنے والوں نے کی ہے، اس کے علاوہ ان کی غزل جمیل بھی اور جلیل بھی ساتھ ہی ان میں وسعت خیال، وست قلب کی مینا کاری بھی ہے —— اس لئے ولی کا ذکر سراج کے ساتھ کریں گے۔

مرزا داؤد۔ ولی اورنگ آبادی کے زمانے کے شاعر تھے۔ ان سے چھوٹے تھے ۱۷۵۷ء میں وفات پائی۔ ولی نے اپنے کلام میں جو پختگی اور زبان میں جو ہمہ گیریت پیدا کی تھی۔ داؤد نے اسے اور آگے بڑھایا۔ ان کی آواز میں لوچ اور کشش تھی —— غزل پڑھتے تھے تو لوگ جھوم جھوم جاتے تھے۔

نمونہ غزل

مرا احوال چشم یار سے پوچھ — حقیقت درد کی بیمار سے پوچھ
مرے حال پریشاں کی حقیقت — صنم کے زلف کے ہر تار سے پوچھ
مری ہر اک صدائے آہ کا پیچ — صنم کے چہرۂ طلدار سے پوچھ

خاکی ولی کے ہمعصروں میں سے تھے۔ انہوں نے بھی ریختی کی طرف توجہ دی ہے۔

لیکن اس میں تصوف کی چاشنی نمایاں ہے۔ دیوان ابھی طبع نہیں ہوا۔

نمونۂ کلام

پیابن اکے سہیلی انجھوؤں سے مکھ کو دھوتی ہوں
کبھی رات میں گھر اندھارا دیکھ روتی ہوں
رہوں کیوں ابتدا ہی میں وسے جب انتہا مجھ کو
فنا فی الشیخ ہو کر میں بقا باللہ ہوتی ہوں

عاصی، ناصر اور عاجز نے بھی دکن کے اس دور میں غزلیں کہی ہیں، ان کی غزلوں کا نمونہ بالترتیب درج ذیل ہے۔

عاصی

تجھ غم کی آگ دل میں رکھا ہوں چھپا کے میں
ڈرتا ہوں تا اُلک نہ اڑے شرر کہیں
تجھ قد کی جب سے نقل کیا ہے چمن میں جا
دیکھا نہ تب سے سرو نے ٹک ثمر کہیں
سمجھے ہیں ہم کہ اب کہیں تم نے بھی دل دیا
بیٹھے کہیں ہو بات کہیں ہے نظر کہیں

نین تیرے شکار کرتے ہیں | دل ہمارا افگار کرتے ہیں
خوب رو جب سنگار کرتے ہیں | آدمی پر بہار کرتے ہیں
ہل دل گریۂ ندامت میں | سیر ابر بہار کرتے ہیں
چشم بد دور دلبراں سارے | اپنے ناصر کوں پیار کرتے ہیں

عاجز اشعار

عید ہے وصل ترا مجھ کو طرب کی سوگند
آشتابی ہیں تجھے میری طلب کی سوگند

تجھ مکھ کوں دیکھ چاند گگن سیں گیا اُکھڑ
تجھ قد کوں دیکھ سرو چمن سیں گیا اُکھڑ

چمن میں چل کے سجن بے حجاب ساغر کھینچ
بہار رنگ گلستاں کے سر سیں چادر کھینچ

کر آرسی کی طرح تماشائے خوب و زشت
دل میں کسی سیں عکس نہ رکھ اے صفا سرشت

اس دور میں غزلیں بہت کم ہی لکھی گئی ہیں، اسوقت سخنوروں کی توجہ زیادہ تر مثنوی کی طرف مائل تھی —— اور لوگ مثنویاں دھڑا دھڑ لکھ رہے تھے۔ —— اس دور کو اگر مثنویوں کا دور کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔——

اس زمانے میں غزل کہنے والے چند شاعر دکھائی دیتے ہیں لیکن افسوس انہوں نے بھی سنجیدگی اور پوری توجہی کے ساتھ اس صنف کی طرف توجہ دی اور نہ ہی غزل کی صحیح رعایات کا احترام کیا۔ بس مقامی رنگوں کو اکٹھا کر کے اپنی افتاد طبع کے مطابق غزل کو تراش کے رکھ دیا —— اور اس طرح جنوبی ہند کی دھرتی میں یہ بیج بو دیا۔

غزل کے اس دور میں جب ولی اور سراج آتے ہیں تو غزل میں

نئی روح بیدار ہوتی ہے۔ ان سے پیشتر کوئی بھی صحیح طرح فریضۂ غزل انجام نہ دے سکا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان دونوں نے غزل کی تزئین کی اور اس کی آرائش میں اپنی صلاحیتوں کو رچا بسا دیا۔

یہ صحیح ہے کہ ولی اورنگ آبادی پہلے غزل گو شاعر نہیں ہیں لیکن پھر بھی انہیں غزلگوئی میں ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے ——— سب سے پہلے غزل انہیں کے ہاتھوں "غزل کے مرتبہ" تک پہنچی۔ اور انہوں نے فارسی غزل کی روح نکال کر اردو غزل کو بخشی۔ اور وہی انداز اختیار کیا جو فارسی غزل گو کے حصے میں آیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ولی نے ہندی کے پیکر سے حسین رنگ کھینچ کر فارسی انداز میں حل کر دیئے اور اس طرح ہندی کی نمکینیت فارسی کی شیرینی اور حلاوت میں داخل کر دی ——— اور اپنے رنگ تغزل میں ایک نکھار پیدا کر لیا۔

ولی کی زبان قدما کی نسبت زیادہ لوچدار، زیادہ پاکیزہ، زیادہ نتھری ہوئی اور زیادہ حلاوت زدہ ہے ——— ردیف اور قافیہ کے انتخاب میں بھی انہوں نے حسن ذوق کا ثبوت دیا ہے ——— ان کی غزلیں، داخلیت اور خارجیت کا پرجمال امتزاج ہیں۔ حسن وعشق کے نئے مضامین اور خیالات اور ہلکے پھلکے الفاظ سے انہوں نے غزل میں اضافے کئے ہیں۔ اور آفاقی واردات وکیفیات کی بڑے سلیقہ سے عکاسی ہے۔ ان کے ہاں بناوٹ، تکلف اور تصنع نہیں ہے۔ دل کی باتیں انتہائی خلوص کے ساتھ سیدھی سادی زبان میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ ———

ولی کی غزلوں میں تصوف کی چاشنی بھی موجود ہے۔ انہوں نے حلاوت نمکینیت، سادگی، خلوص، ترنم اور حسن انتخاب کے علاوہ غزل میں پاکیزگی کے سائے بھی گوندھ کر رکھ دیئے ہیں غرضیکہ ولی کے یہاں اردو غزل زبان و

بیان کے اعتبار سے سنبھل کر پہلی مرتبہ اپنے نئے روپ میں آئی ہے ــــــــــ گاھے گاھے حیات و کائنات کے مسائل پر بھی انہوں نے طبع آزمائی کی ہے جو اُردُو غزل کے لئے بالکل نئی بات تھی۔ ولی کے ہاں باوجود قدامت کے وہ تمام عناصر ہیں۔ جن سے غزل کا مزاج ترتیب پاتا ہے۔

نمونۂ کلام

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہے ترے نین غزالاں سوں کہوں گا
دی حق نے تجھے بادشہی حسن نگر کی
یہ کشور ایران میں سلیماں سوں کہوں گا
زخمی کیا ہے مجھ تری پلکوں کی انی نے !
یہ زخم ترا خنجر بھالاں سوں کہوں گا
بے صبر نہ ہو اے ولی اس درد سے ہرگاہ
جلدی سے ترے درد کی درماں سوں کہوں گا

خوب رو خوب کام کرتے ہیں　　یک نگہ سے غلام کرتے ہیں

بلبل و پروانہ کرنا دل کے تئیں　　کام ہے تجھ چہرۂ گلنار کا

دل چھوڑ کے یار کیوں کہ جاوے　　زخمی ہے شکار کیونکہ جاوے

دشمن دین کا دین دشمن ہے　　راہزن کا چراغ راہزن ہے

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اسکو / کرتی ہے نگہ جس قدِ نازک پہ گرانی

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شبِ خلوت میں دلبر سے / سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

یک نقطہ ترے صفحۂ رُخ پر نہیں بے جا / اس مکھ کو ترے صفحۂ قرآں سوں کہوں گا

یک گل کر اس حال میں اس وقت نہ پاوے / جس وقت چمن بیچ وہ رشکِ چمن آوے

گل ہوئے غرقِ آبِ شبنم میں / دیکھ اس صاحبِ حیا کی ادا

دل لجاتے ہیں اے ولی میرا / سرو قد جب خرام کرتے ہیں

ولی اس گوہرِ کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی / مرے پہلو میں یوں آوے جیوں سینے میں راز آوے

اے ولی دردِ سر کبھو نہ رہے ! / جب ملے صندل و گلابِ سخن

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین / جا کہو کوئی محمد شاہ سوں !

عشق کی راہ میں مسافر ہوں / ہر قدم مجھ گلی میں منزل ہے

مفلسی سب بہار کھوتی ہے ! / مرد کا اعتبار کھوتی ہے

باعث رسوائی عالم وؔلی ٭ مفلسی ہے مفلسی ہے مفلسی

دیکھا ہے جن نے تیرے رخسار کا تماشہ ٭ نہیں دیکھتا سُرج کی جھنکار کا تماشہ

مجھ کو پہنچی ہے آرسی سوں یہ بات ٭ صاف دل وقت کا سکندر ہے

وؔلی میرا جنوں جو کوئی کہ دیکھے ٭ اُسے کوہ و بیاباں یاد آوے

وؔلی کو اس وجہ سے اولیت کا شرف حاصل ہے کہ اس نے غزل کو وسعت دے کر اس میں نئے انداز پیدا کئے اور اسے ایک نیا آہنگ بخشا۔

وؔلی نے جس روایت کو اپنی غزلوں میں قائم کیا، سراج نے بڑی خوبی سے اسے اپنی غزلوں میں برتنے کی کوشش کی ہے —— سراج صوفی تھے —— اس لئے انہوں نے تصوّف کو غزل میں داخل کر کے اُردُو غزل میں اضافہ کیا۔ ان کی زبان بھی سادہ اور سلیس ہے۔ اور انہوں نے تصوّف کی باتیں حسن و عشق کی زبان میں بڑے سنبھلے ہوئے انداز کے ساتھ ادا کی ہیں —— ان کے مضامین میں شگفتگی اور تازگی اور خیالات میں صفائی اور سادگی ہے۔ بناوٹ اور تصنع سے انہوں نے حذر کیا ہے —— اس کی غزلوں میں ایک کیفیت اور سرور کی سی کیفیت ہے —— احساس کی شدّت ہے اور خلوص ہے —— غزل کو آگے بڑھانے میں، وؔلی کے ساتھ ساتھ انہوں نے بھی نمایاں حصّہ لیا ہے۔

شاہ سراج کی یہ غزل بہت مشہور ہے۔

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی

نہ تو تُو رہا، نہ تو میں رہا جو رہی سو بیخبری رہی

شہہ بیخودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنون کی پردہ دری رہی

چلی سمت غیب سے کیا ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

نظرِ تغافلِ یار کا گلہ کس زباں میں بیاں کروں
کہ شراب صد قدح آرزو خُمِ دل میں تھی سو بھری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جیوں دھری تھی یونہی دھری رہی

ترے جوشِ حیرتِ حسن کا اثر اس قدر سیں یہاں ہوا
کہ نہ آئینہ میں جلا رہی نہ پری کی جلوہ گری رہی

کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بینوائے سراج کوں !
نہ خطرہ رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

چند اشعار

پی بن مجھ آنسوؤں کے شراروں کی کیا کمی | جس رات چاند نہیں تاروں کی کیا کمی

دھوپ میں غم کے عبث جی کو جلایا افسوس | پیو کے سائے میں اماں تھا مجھے معلوم نہ تھا

نہیں ہے تاب مجھے سامنے تمہارے جاناں | کہاں سراج کہاں آفتاب عالم تاب

اب اردو شعر و نغمہ کی دوشیزہ جنوبی ہند (دکن) کے سبزہ زاروں سے نکل کر شمالی ہند کا رُخ کرتی ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے تک، شمالی ہند میں اردو شعر کہنے کا کوئی

مستقل رواج نہیں تھا۔ فارسی گو شعرا تفنن طبع کے طور پر کبھی کبھی اُردو میں شعر کہہ لیا کرتے —— اس قسم کے شاعروں میں مرزا عبدالقادر بیدل، مرزا عبدالغنی قبول اور سراج الدین علی خاں آرزو وغیرہ شامل ہیں۔

انھوں نے اس قسم کے اردو اشعار تخلیق کیے

من کی بستی آج مری آنکھ موں پری
غصہ کیا وگال دیا اور دگر لری!

—— (قزلباش خان امید)

از زلف سیاہ تو بدل دوم پری ہے
در خانۂ آئینہ گتا جھوم رہی ہے

—— (مرزا معز موسوی خاں فطرت)

ولی اورنگ آبادی جب دلی تشریف لاتے (غالباً ۱۷۰۰ء) اور یہاں کے لوگوں نے ان کا دیوان دیکھا اور پڑھا تو بہت ہی متاثر ہوئے —— اور انہیں اردو شعر و شاعری سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی —— حاتم، مظہر، آبرو، ناجی اور فغاں وہ شعرائے دہلی ہیں۔ جنہوں نے ولی کا کلام خود ان کی زبان سے سنا —— اور ان کی غزلوں پر غزلیں لکھیں ——!

ولی کے زور بیان اور روانی سے شاعر ہی اثر پذیر نہیں ہوئے۔ بلکہ عام لوگ بھی ان کے اشعار گلیوں میں گنگنانے لگے۔

ولی کا کلام شمالی ہند کے شعرا کے واسطے نمونہ بن گیا اور اسے دیکھ کر تمام شعرائے دلی آگے بڑھنے لگے اور کچھ ہی دنوں میں غزل کی "دھوپ چھاؤں" نے شمالی ہند کا احاطہ کر لیا۔

اس زمانے کی غزل کی اساس کافی حد تک ولی اور اس کی قائم کردہ روایات

پر استوار ہے۔ اس زمانے کے شاعروں میں حاتم (۱۶۹۹ء۔ ۱۷۹۱ء) خان آرزو (۱۶۸۹ء۔ ۱۷۵۶ء) شاکر ناجی، مضمون آبرو اور مصطفےٰ خان یک رنگ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

ولی کے یہاں جو الفاظ تھے، ان لوگوں کے یہاں نہیں یا بہت کم ہیں۔ ان کی شاعری "فارسیت" میں رنگی ہوئی ہے اور فارسی الفاظ اور ترکیبیں بکثرت ملتی ہیں —— ایہام گوئی اس زمانے کا مخصوص انداز ہے اور ہر شاعر کے کلام میں اس کے اثرات موجود ہیں۔ اور یہ سب کچھ فارسی تقلید کا نتیجہ تھا۔ اس زمانے میں بیدل اور صائب کا بہت چرچا تھا اور شاعر ان کے تتبع میں شعر کہنا باعث افتخار سمجھتے تھے —— اور یہی وجہ تھی کہ ان کا مخصوص انداز اردو شاعری میں بھی در آیا۔ اردو غزل گو شعرا لفظوں کی بازی گری سے جی بہلانے لگے۔ اور ایہام گوئی کا انداز اختیار کر کے اسے انتہا تک پہنچا دیا —— حاتم ان میں سب سے بڑے شاعر ہیں۔ ایہام گوئی کے خلاف سب سے پہلے انہوں نے علم بغاوت بلند کیا۔ اور ہندی کے نامانوس اور بے رس الفاظ غزل سے نکال کر اصلاح شعر اور درستی زبان کے لئے عملی قدم اٹھایا —— اور پرانی طرز چھوڑ کر نئے انداز میں غزلیں کہنی شروع کر دیں۔

حاتم کے پہلے کلام میں صفت ایہام کی کثرت ہے لیکن بعد میں انہوں نے ایہام گوئی سے منہ موڑ لیا، اور ایک دیوان، اپنے کلیات سے منتخب کر کے مرتب کیا اور اس کا نام "دیوان زادہ" رکھا۔

حاتم نے جب اس بھدے پن کے طوق کو جو اردو شاعری کے گلے میں پڑا تھا۔ دور کیا تو یہ تحریک باقاعدہ چل نکلی اور آنے والے شعرا زبان کے نکھار اور رس کی طرف توجہ دینے لگے۔

اس عہد میں شاعری کی دھوم مچی تھی، اور اسی لئے بہت سے شاعر منظرِ عام پر آگئے جن میں سے مظہر جانِ جاناں، سودا، میر اور درد خاص طور پر مشہور ہیں۔ یہ دورِ غزل کی ترقی کا دور ہے اور یہ غزلیں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ ان بزرگوں نے اپنی سعیِ جمیلہ سے غزل کے مضامین اور زبان میں حسن بھر کر رکھدیا ——— سودا قصیدہ کے بادشاہ ہیں۔ انہوں نے قصیدہ کے علاوہ بہت ہی اچھی غزلیں بھی کہی ہیں۔ سودا اگر غزل کی طرف اور زیادہ توجہ دیتے تو وہ غزل میں قابلِ قدر اضافے کر سکتے تھے۔ ان کی شاعری میں داخلیت اور خارجیت کی خوشگوار آمیزش ہے۔

نمونۂ کلام

گل پھینکے ہے غیروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی

کیا ضد ہے مرے ساتھ خدا جانے وگرنہ
کافی ہے تسلّی کو مرے ایک نظر بھی

سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

نسیم ہے ترے کوچے میں اور صبا بھی ہے
ہماری خاک سے دیکھو تو کچھ رہا بھی ہے

جلے ہے شمع سے پروانہ اور میں تجھ سے
کہیں مہر بھی جگ میں، کہیں وفا بھی ہے

خیال اپنے میں گر ہوں ترا نہ سنجان مت
کراہنے کو دلوں کے کبھی سنا بھی ہے

ستم روا ہے اسیروں پہ اس قدر صیاد
چمن چمن کہیں بلبل کی اب نوا بھی ہے

سمجھ کے رکھیو قدم دشتِ خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

میرزا، میر اور درد کے دور کو ہم غزل کا زریں دور کہہ سکتے ہیں۔ میر کے یہاں غزل اپنی پوری رعنائیوں، نزاکتوں اور جمال کے ساتھ جلوہ پیرا ہے۔ غزل کے سلسلے میں میر کا نام بڑے ادب و احترام سے لیا جاتا ہے۔ میر کی غزلوں سے یاسیت قنوطیت اور حرماں نصیبی مترشح ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے غم و اندوہ کے

ساون بھادوں میر پر برس رہے ہیں اور میر ان میں بھیگتے چلے جا رہے ہیں —— غم جاناں اور غم دوراں کی کتنی ہی تصویریں میر نے پیش کی ہیں —— میر کے ہاں جو رنج و محن کے مرقع ہیں وہ اپنے اندر آفاقیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں ہمہ گیر انسانی ذوق کی بڑی پاسداری کی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جی کو بھلی لگتی ہیں —— میر افسردہ رہتے ہیں۔ انہوں نے اگر کہیں مسکرانے کی سعی کی ہے تو اس میں تصنع نظر آتا ہے۔

شاعری میر کے مزاج میں رچی بسی ہوئی تھی اور اسی لئے وہ غزل پر چھائے ہوئے ہیں زبان میں جدت، فصاحت، سلاست، نرمی اور خلوص ہے۔ رعنائی ہے حسن اور جمال ہے جمال بھی ایسا جو پژمردہ ہے —— اس پژمردگی نے حسن کو اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے —— میر نے آورد، تصنع، بناوٹ اور تکلف سے حذر کیا ہے۔ قلبی واردات اور کیفیات کو دلکش اسلوب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کی غزل کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی تاثیر ہے۔ —— اور اس کی وجہ ان کا وہ لب و لہجہ ہے، جو انہوں نے غزلوں میں اختیار کیا ہے۔

میر نے کہیں کہیں اخلاقی اور حکیمانہ شعر بھی کہے ہیں —— میر کے اشعار اور غزلیں ایمائیت کے بھرپور رنگ لئے ہوئے ہیں لیکن ان کی غزلوں کی طوالت کھٹکتی ہے۔ فن کے پرکھنے والوں نے غزل کے ساخت میں اشعار کی تعداد متعین کی ہے اور بیجا طوالت کو عیب قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک غزل میں نو یا دس شعر ہونے چاہئیں۔ کیونکہ زیادہ اشعار اور قافیہ و ردیف کی بھرمار سے غزل کا لطیف اور نازک پیکر بوجھل ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کے حسن میں بے ڈھنگا پن داخل ہو جاتا ہے —— اپنی غزلوں کے طوالت کی طرف

میر نے خود بھی اشارہ کیا ہے۔

(۱) گو غزل ہو گئی قصیدہ سی   (۲) عیب طول کلام مت کریو!
عاشقوں کا ہے طول حرف شمار   کیا کروں میں سخن سے خوگر تھا

اس کے باوجود خدائے سخن میر نے اپنی غم آفرین غزلوں میں ایسا سحر پیدا کیا ہے جس کے اثر سے ہم بچ نہیں سکتے —— ان کے ہاں کلاسکیت ہے، اور ان کی غزلیں جیتا جاگتا اعجاز ہیں —— راحت سرمدی کی پالن ہار ہیں۔

شاعر اپنے جذبات، احساسات اور تجربات کی صحیح صحیح عکاسی کرتا ہے۔ واردات قلبی کی سچی ترجمانی اور زندگی کی صداقتوں کی غمازی میں کسی قسم کے تخیل سے کام نہیں لیتا —— یہی حال میر کا ہے۔ میر نے خلوص اور صداقت سے احساسات وجذبات کی حقیقی تصویریں پیش کی ہیں۔ طبع انسانی کے اکثر اساسی تقاضوں کا بڑا لحاظ رکھا ہے —— روایتی مضامین کے علاوہ انہوں نے اس دنیا میں جو تجربات حاصل کئے، انہیں ہو بہو، بے تکلفی اور بے ساختگی سے سامنے رکھ دیا۔

میر سادگی کا احترام کرتے ہیں، اور جذبۂ دل کو سادہ الفاظ میں کہہ دیتے ہیں اپنی شاعری میں وہ تزئین اور آراستگی کے قائل نہیں۔ مصنوعیت اور غلو سے بھی احتراز کیا ہے۔

میر کی ایمائی کیفیتیں اپنے جوبن پر ہیں —— اجمال اور ایمائیت ہی ایسی چیزیں ہیں جو رنگ تغزل کو گہرا کرتی ہیں۔

اس کے علاوہ میر کا لہجہ عام ہے —— اور غزل کے شعروں میں وہ باتیں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں —— اور ترنم کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

عوامی انداز بیان کی طرف خود اشارہ کیا ہے۔

شعر میرے ہیں گو خاص پسند
گفتگو پر مجھے عوام سے ہے

اور سچ تو یہ ہے کہ میر کی غزل میں موسیقی اور غم نے ایک لطف سا پیدا کر کے رکھ دیا ہے۔ میر کی عظمتوں کو بہت سی ہستیوں نے تسلیم کیا ہے اور نہ صرف داد دی ہے بلکہ تقلید بھی کی ہے —— میر کی برتری کے گن جدید زمانے کے شعرا ہی نہیں بلکہ ماضی کے شاعروں نے بھی گائے ہیں۔

غالب معتقد ہیں اور ان کی استادی کے دل سے قائل ہیں

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ؛
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب؛
جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں

ناسخ کہتے ہیں

معترف کون نہیں میر کی اُستادی کا
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

ذوق گویا ہیں

؛ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب

ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

اکبرؔ الہ آبادی

میں ہوں کیا چیز جو اس طرز پہ جاؤں اکبرؔ
ناسخؔ و ذوقؔ بھی جب چل نہ سکے میرؔ کے ساتھ

میرؔ نے خود بھی کتنی ہی جگہ اپنے بارے میں اس قسم کے شعر کہے ہیں۔

ریختہ خوب ہی کہتا ہے جو انصاف کرو
چاہیئے اہلِ سخن میرؔ کو اُستاد کریں!

جدید زمانے میں اثرؔ لکھنوی، خلیل الرحمان اور ناصر کاظمی وغیرہ بھی میرؔ کے مداحوں میں ہیں۔

میرؔ کی غزلوں میں ان کا یہ انداز تو بہت ہی بھلا لگتا ہے۔ جب وہ میاں۔ پیارے، ارے۔ صاحب وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں۔ اور اپنے آپ سے خطاب کرتے ہیں۔

نمونہ کلام

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ
مذہب عشق اختیار کیا!

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

اقرار میں کہاں ہے انکار کی سی خوبی؟
ہوتا ہے شوق غالب اس کی نہیں نہیں پر

رات ساری تو کٹی سنتے پریشاں گوئی
میر جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

پڑھتے پھرینگے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں!

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو!
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے!

گلشن میں آگ لگ گئی تھی رنگِ گل سے میرؔ
بلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے

مرا شور سُن کے لوگوں نے کیا پوچھا تو کہہ بے کیا؟
جسے میرؔ کہتے ہیں صاحبو! یہ وہی تو خانہ خراب ہے،

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

ہم فقیروں سے کج ادائی کیا! آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا! آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میرؔ پھر ملیں گے اگر خدا لایا

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے

چلتے ہو تو چمن کو چلئے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی ہے

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

گل و آئینہ و خورشید و ماہ کیا
جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رو تھا

بہت سعی کریئے تو مر رہیئے میرؔ
بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

جی تو جانے کا ہمیں اندوہ ہی ہے پر ہائے میرؔ
حشر کو اٹھنا پڑے گا پھر یہ اک غم اور ہے

کیا آگ کی چنگاریاں سینے میں بھری ہیں
جو آنسو مری آنکھ سے گرتا ہے شرر ہے

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
کس کا کعبہ کیسا قبلہ کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا
یاں کے سپید و سیاہ میں ہمکو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا
میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

فقیرانہ آئے صدا کر چلے — میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لئے — ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے
کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ — سو تم ہم سے منہ کو چھپا کر چلے
دکھائی دیئے یوں کہ بیخود کیا — ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے
پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے — نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے!

کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میرؔ
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

کچھ کرو فکر اس دوانے کی — دھوم ہے پھر بہار آنے کی

خواجہ دردؔ کی آمد کے ساتھ شوخ، چنچل اور افسردہ غزل، معصوم اور باحیا بن جاتی ہے۔ دردؔ صوفی تھے اور اسی لئے عرفان اور تصوف کے مضامین بڑے سلیقے سے انہوں نے غزل میں بیان کئے ہیں —— ان کی غزلیں ان کے مزاج کا پرتو ہیں۔ —— خواجہ درد نے اپنی مساعی جمیلہ اور کاوش حمیدہ سے صوفیانہ غزل کو کہکشاں تک پہنچا دیا تصوف کی باتیں کہنے والا اتنا بڑا شاعر نہ ان سے پہلے ہوا ہے اور نہ بعد ہی میں —— اور یہ ان کی صوفیانہ طبیعت کا ہی فیض ہے کہ ان کی غزل میں مصائب زندگی کے خلاف شکایتوں کا وہ انداز نہیں جو میرؔ کے کلام میں ملتا ہے۔ تصوف صبر، قناعت، عمل، توکل اور استقامت و پامردی کا نام ہے —— دردؔ کا زمانہ ہلاکت خیزیوں کا زمانہ تھا۔ سیاسی و اقتصادی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ شیرازہ بندی کا فقدان تھا۔ لاقانونیت غیر اعتمادی اور زندگی سے فرار اپنے شباب پر تھا —— لیکن خواجہ نے ایسے حالات میں صبر وضبط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور اپنے مسلک سے دوری اختیار نہ کی۔ سب نے دلی چھوڑ دی پر آپ نہ گئے۔ ——

خواجہ درد نے غزل میں نہ صرف روحانیت اور تصوف کے مسائل بیان کئے ہیں بلکہ اسے سادگی سلاست، شیرینی اور حلاوت بھی بخشی ہے۔ ان میں ناقابلِ فراموش شوکت و جلالت بھی ہے ــــــ ان کے خیالات نکھر سے اُٹھے ہیں۔ اور ڈھلے ڈھلائے الفاظ میں مسائل تصوف اس طرح حسین اور دلآویز پیرائے میں بیان کئے ہیں کہ ان کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی ــــــ عاشقانہ رنگ بہت گہرے ہیں لیکن اساتذہ سلف کی مانند ان کا معشوق ہرجائی اور بازاری نہیں بلکہ اس سے معشوق حقیقی مراد ہے ــــ عشق مجازی کی بجائے وہ عشق حقیقی کے حضور میں، اپنی غزلوں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ طہارت اور پاکیزگی آپ کو عزیز تھی اسی لئے آپ نے یہ چیزیں غزل کو سونپ دیں۔ غزل میں اگر کسی جگہ مجازی رنگ آبھی گیا ہے تو اسے بھی انتہائی نرمی، حلاوت اور شیرینی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اور پھر بھی غزل کی پیشانی پر تصوف کی شکن اسی طرح ابھری ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ طبیعت کی نفاست اور حق پرستی کا یہ عالم تھا کہ آپ نے زندگی بھر نہ کسی کی تعریف میں کوئی قصیدہ کہا اور نہ ہی کسی کی ہجو کی ــــــ متانت، تقدس اور پوترتا سے بھری ہوئی، ان کی غزلیں اس صاف و شفاف ندی کی مانند ہیں، جو بلوریں سرزمین میں بہہ رہی ہے ــــــ جس کی تہہ میں دمکتے موتی تو ہیں۔ لیکن خذف ریزے نہیں ــــــ!

خواجہ درد کے معاصرین اور بعد میں آنے والے انہیں احترام کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں ــــ میر تقی میر اور میر حسن ایسی بزرگ ہستیاں بھی ان کی برتری اور بزرگی کی قائل ہیں۔ ــــــ

مولانا آزاد آبِ حیات میں لکھتے ہیں

"تصوف میں جیسا انہوں نے لکھا اردو میں آج تک کسی سے نہیں ہوا۔"

"چھوٹی بحروں کی غزلیں گویا تلواروں کی آبداری نشتروں میں بھر دی ہے"۔
یا بقول امیر مینائی مرحوم لپسی ہوئی بجلیاں معلوم ہوتی ہیں ——— !
غرضیکہ خواجہ کا کلام روح کی طرح پاکیزہ اور بے عیب ہے ——— ابتذال اور رکاکت تو کجا اس میں بدمذاقی اور بیہودگی کا چھینٹا تک بھی نہیں ——— اسی لئے میر حسن نے دیوان درد کو "سراپا انتخاب" کہا ہے۔

نمونۂ کلام

رات مجلس میں ترے حُسن کے شعلے کے حضور
شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نُور نہ تھا

تجھ سے کچھ دیکھا نہ ہم نے جز جفا — پر وہ کیا کچھ ہے کہ جی کو بھا گیا
شیخ کعبہ ہو کے پہنچا ہم کنشت دل میں ہو — درد منزل ایک تھی ٹک راہ ہی کا پھیر تھا
کیا فائدہ درد شور و شر سے — پہنچے ہے جو کچھ سو مار جی ہیں ؟
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے؟ — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب — کس طرف سے آتے تھے کیدھر چلے؟
روندے ہے نقش پا کی طرح خلق یاں مجھے — اے عمر رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے !
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ — جب تلک بس چل سکے ساغر چلے ۔
اصلاح سے یک لخت جو آنسو نہیں تھمتے — معلوم ہوا درد کہیں آنکھ لڑی ہے

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا — تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
جان سے ہو گئے بدن خالی — جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا
نالہ فریاد آہ اور زاری — آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا
ان لبوں نے نہ کی مسیحائی — ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

زور عاشق مزاج ہے کوئی
دردؔ کو قصہ مختصر دیکھا

تو بن کہے گھر سے کل گیا تھا
اپنا بھی تو جی نکل گیا تھا

اب دل کو سنبھالنا ہے مشکل
اگلے دنوں کچھ سنبھل گیا تھا

آنسو مرے جو انہوں نے پونچھے
کل دیکھ رقیب جل گیا تھا

پھر ہونے لگا یہ دل تو بے چین
کتنے روزوں بہل گیا تھا!

بارے پھر مہرباں ہوا ہے
بے طرح سے کچھ مچل گیا تھا

شب ٹک جو ہوا تھا وہ ملائم
اپنا بھی تو جی پگھل گیا تھا

ہیں سامنے سے جو مسکرایا
ہونٹھ اُس کا بھی دردؔ بل گیا تھا

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

وحدت میں تیری حرفِ دوئی کا نہ آ سکے
آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے

قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے
اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

مرا جی ہے جب تک تری جستجو ہے
زباں جب تلک ہے یہی گفتگو ہے

خدا جانے کیا ہوگا انجام اس کا
میں بے صبر اتنا ہوں وہ تند خو ہے

تمنا ہے تیری اگر ہے تمنا
تری آرزو ہے اگر آرزو ہے

کیا سیر سب ہم نے گلزار دنیا
گُلِ دوستی میں عجب رنگ و بُو ہے

جب کہا میں کہ تم خبر لینا — دل پہ آفت نداں ہے پیارے
ایک دم میں تو جی ہی جاتا ہے — زیست اب کوئی آن ہے پیارے
تب لگا کہنے سچ یوں ہی ہوگا — کیا پر اس کا بیان ہے پیارے
میرے دل کی پوچھیے یہ ہے — جان تو اپنی جان ہے پیارے
تجھ سے مر جائیں گے تو مر جائیں
جان ہے تو جہاں ہے پیارے

میر، سودا، درد اور میر حسن وغیرہ کا یہ دور دلّی کا دبستان شاعری کہلاتا ہے۔ یہاں سے زمانے کا رُخ بدلتا ہے اور غزل ایک نئے جادہ پر چل نکلتی ہے —— دلّی اُجڑتی ہے تو اس کی بہاریں بھی دم توڑ دیتی ہیں —— دلّی کی تباہی شاعروں سے دیکھی نہیں جاتی اور وہ وقت کے ہاتھوں مجبور ہو کر فیض آباد اور لکھنؤ وغیرہ کا رُخ کرتے ہیں —— اور اس طرح ایک نئے دبستان شاعری کا ظہور ہوتا ہے —— جسے لکھنؤ کا دبستان شاعری کہا گیا ہے —— اس سے مُراد یہ ہے کہ لکھنؤ کے شاعروں نے شعر و شاعری کا وہ قدیم رنگ جس کی نشو و نما دلّی کے شعرا نے اپنے خون جگر سے کی تھی، تیاگ کر سخن گوئی کا ایک نیا انداز پیدا کر لیا۔ اور دلی والوں کی روش سے ہٹ کر، اپنی ایک علیحدہ راہ پیدا کر لی —— دبستان لکھنؤ کی تصویریں انشا، جرأت، رنگین، مصحفی اور ناسخ و آتش کے یہاں ملتی ہیں —— اس دور کی غزل، اس غزل سے قطعاً مختلف ہے جس کی روایات دلی کے ہاتھوں قائم ہوئی تھیں اور جن کا احترام میر وغیرہ کے دور تک کیا جاتا رہا تھا۔

لکھنؤ میں شاعری کی ترویج دلّی والوں کے ذریعے ہوئی۔ میر، سودا، میر حسن

جرأت ، انشا ، رنگین ، ان سب کا تعلق دلّی ہی سے تھا ، لیکن چوں کہ لکھنؤ میں حالات مختلف تھے ۔ اس لئے دلّی کے بعض شعرا دلّی ہی کی قائم کردہ روایات کو چھوڑ دینے پر مجبور ہو گئے ۔ اور انہوں نے " لکھنویت " کو اپنا لیا ۔ " لکھنویت " اپنانے والوں شاعروں میں انشا ، رنگین اور جرأت خاص طور پر قابل ذکر ہیں ——— انشا اور رنگین کے نئے انداز کی تو اس قدر تشہیر ہوئی کہ اس انداز نے مخصوص صورت اختیار کر لی ——— یہ انداز دلّی کے انداز کے قطعاً برعکس تھا ——— اس تضاد کی سب سے بڑی وجہ لکھنؤ کی معاشرت تھی ۔ دولت کی فراوانی اور یہاں کی تعیش پسندی و تماش بینی اور " دربار کی سرپرستی " نے شاعروں کو صحیح راستے سے بھٹکا دیا ۔ اور غزل کا تصور بدل گیا ۔ یہی نہیں بلکہ ان شاعروں میں آپس میں رقابت بھی پیدا ہو گئی ۔ اور شاعرانہ مقابلوں میں ایک دوسرے پر گندگی اچھالنے لگے ——— انشا اور مصحفی کے ہنگامے اسی عداوت اور رقابت کی پیداوار ہیں

لکھنؤ کے ماحول سے تاثر لے کر جب شاعر دلّی کی ادبی روایت سے الگ ہو گئے تو انہوں نے تصنع ، بناوٹ ، تکلف اور غلو کا سہارا لیا ——— وہ خلوص ، جذبات و احساسات وغیرہ کو تج کر خارجیت میں کھو گئے ——— دل کو چھوڑ کر باہر سے اس قدر مصنوعی رنگ حاصل کئے کہ غزل کا اپنا حسن ان میں مستور ہو کر رہ گیا ——— اور اس طرح وقتی کیفیت کی وجہ سے غزل کا روپ سروپ چخ چخ کر اپنی کشش گنوا بیٹھا ——— یہ الگ بات ہے کہ ان میں شعرا کا کوئی قصور نہیں ، معاشرہ کا بھاؤ ہی کچھ اس طرف تھا ۔ شاہوں اور رئیسوں کی " مزاجیت " نے شاعری میں داخل ہو کر شاعری کو بھی رنگ رلیوں میں غرق کر دیا ——— اور شاعری کا یہ عیب ہنر بن گیا ۔ اب شاعری صرف معاملات کی غمازی اور واقعات کی نمامی تک محدود ہو کر رہ گئی ۔ اور اس کا ردّ عمل یہ ہوا کہ میر و درد کی غزلوں کے

عناصر ماحول کے دھندلکوں میں گم ہو گئے۔

دلی کی غزل کا فطری حسن اور لوچ من موہ لیتا ہے۔ اس کے برعکس لکھنؤ کی غزل میں یہ بات کہاں — وہاں تو غزل کا جمال خارجیت، ظاہریت اور بناوٹ کے غازہ اور سرخی میں دب کے رہ گیا ہے۔ جو کشش قدرتی حسن میں ہے وہ تصنع کے محتاج، جمال میں کہاں؟ — نہ اس میں ادائیں ہیں، نہ ناز ہے، نہ غمزے ہیں، نہ انانیت، نہ بانکپن ہے، نہ چھلبل، نہ تقدس ہے اور نہ ہی غصہ ہے — بس تکلف اور مبالغہ کا بوجھ ہی بوجھ ہے — یا الفاظ کی بھول بھلیاں اور صنعت گری کی شعبدہ بازیاں ہیں۔

ہر فن کی نمود خونِ جگر سے ہوتی ہے۔ جو چیز خلوص اور سچے جذبات کی رہین منت ہو وہ دکھاوا، ظاہریت اور مصنوعی تزئین سے کب پرجمال بنتی ہے — لکھنؤ والے نہ تڑپے، نہ انہوں نے دل میں گھٹتے ہوئے جذبات کے جوار بھاٹے کو محسوس کیا اور نہ تخیل کے گرداب میں اترے، بس ادھر ادھر سے رنگ مانگ مانگ کر کام چلا لیا۔ جو مانگ لہر کی سرخی سے چمکنے کی عادی ہو اور جس پیشانی پر شدید جذبے کے کم کم کی بندیا نکھرتی ہو، وہ مصنوعی چمک سے کب دلوں کو برما سکتی ہے۔

دلی سکول میں آمد، سادگی، تاثیر، خلوص، متانت، پاکیزگی، تعمق، تخیل آفرینی، ژرف نگاہی، صداقت اور داخلیت کا غلبہ تھا۔ لکھنؤ سکول کی خصوصیات میں رنگینی، مبالغہ، آورد، صناعی، صفائی شامل تھیں۔ اس سکول نے خارجی پہلو پر زیادہ نظر رکھی اور الفاظ و محاورات کو درست کرنے میں اپنی قابلیت کا مظاہرہ کیا — اور پھر حکمرانوں اور امیروں کی ظاہرداریاں، نخرے اور بے وقتی نزاکتیں شاعری میں جمع ہو گئیں اور اس طرح معنویت اور داخلیت کی روح ذبح کر دی گئی۔

اور پھر یہ ستم ہوا کہ ان باتوں کی شدت نے لکھنؤ والوں کو مدہوش اور بیخود بنا کر ابتذال اور رکاکت کی چوکھٹ پر لاکھڑا کیا اور ریختہ "ریختی" بن کر رہ گیا —— رنگین کی ہوسناکی اور جرأت کی معاملہ بندی مشہور ہے۔

ریختی غزل کی بدلی ہوئی کیفیت کا دوسرا نام ہے۔ بظاہر اس کی ہیئت غزل کی ہی ہیئت ہے —— اس میں تغزل اور جذباتیت اور سوز و گداز بھی ہے لیکن انھیں پیش کرنے کا ڈھنگ نیا اور نرالا ہے —— غزل کو ایک باحیا اور چھوئی موئی دوشیزہ تصور کریں، تو ریختی کی حیثیت ایک "بیسوا" کی سی ہے —— جو عورت ہوتے ہوئے بھی "عورت پن" سے محروم ہے ——!

ریختی میں عورت کی طرف سے جنسی میلان کی خواہش کی گئی ہے۔ ریختی کہنے میں رنگین پیش پیش ہیں —— اور اس کی ترویج و ترقی میں ان کی کاوشوں کا بے حد دخل ہے —— ان کی دیکھا دیکھی انشاؔ نے بھی کبھی کبھی اس رنگ میں باتیں کہی ہیں۔ رنگینؔ نے ایک جگہ انشاؔ پر خود چوٹ کی ہے۔

ریختی کہنی اجی رنگینؔ کا یہ ایجاد ہے
منہ چڑاتا ہے موا انشاؔ جیسا کس واسطے

گو یہ دور اپنی لذت پسندی اور حسن آشامی کے لئے مشہور ہے۔ اور شاعروں نے اس زمانے میں ایسے ایسے نقشے کھینچے ہیں جنھیں ایک شریف ذہن کبھی بھی پسند نہیں کر سکتا —— لیکن ایسے میں بھی میر حسن اور مصحفی نے اس رنگ سے اپنے آپ کو دور رکھنے کی سعی کی۔ اور اسی لئے ان کے یہاں دلّی کی روایت کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔

میر حسن نے بہترین غزلیں کہی ہیں۔ لیکن انہیں "مثنوی سحر البیان" کی وجہ سے

بلند مرتبہ حاصل ہے —— اس مثنوی کی آب و تاب میں ان کی غزل گوئی کی ضیا پاشیاں چھپ کر رہ گئیں۔

مصحفی بڑے پر گو شاعر تھے۔ ان کے ہاں موضوع کی بوقلمونیاں ہیں — تصوف کے مسائل کو بھی انہوں نے چھیڑا ہے —— ان کی غزلوں میں سوز و گداز، شیرینی، ملائمت لب و لہجہ کی نرمی، جذبات کا بھولا پن اور دل کی باتیں ہیں —— تصنع اور بناوٹ نہیں —— ان کا مرتبہ اردو غزل میں مسلّم ہے۔ اور اپنے دور میں انفرادی حیثیت کے مالک رہے ہیں —— انہوں نے ماحول میں غزل کی روایت کو برقرار رکھا۔

جراٗت نے بھی غزل کی روایت کو سینے سے لگانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن مجموعی طور پر ان کا انداز اپنے پیشروؤں سے مختلف ہے —— جراٗت نے تعیش پسندانہ فضا میں سانس لیا تھا۔ اس تے اس کی فضا کی ساری بہاریں ان کے ذہن اور دل میں رچ بس گئیں۔ اور وہ صنف لطیف کے گن گانے لگے۔

انہوں نے عورت اور اس کے حسن و جمال کی باتوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے —— انہوں نے لکھنؤ کی تہذیب اور معاشرہ سے اس قدر تاثر لیا کہ عشق معنوی کے مضامین اور حسن مطلق کی باتوں کی طرف کوئی دھیان ہی نہیں دیا۔ لذت کوشی اور صنف لطیف کی پرستش کو اپنا شعار بنا لیا —— اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے صنفِ لطیف اور اس کے حُسن و جمال کے تخلیق کردہ اثرات کو اپنی شاعری کی روح سمجھا ہے —— ان کا عشق محض معاملہ بندی تک محدود ہے —— ا

قلندر بخش جراٗت کی زبان انتہائی سادہ ہے اور ان کے اشعار حلاوت زدہ ہیں —— میٹھی میٹھی باتیں، دل کی دھڑکنوں کی تال پر بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔

معاملہ بندی خاص رنگ ہے اور اس میں انہیں کمال حاصل ہے لیکن بعض اوقات یہ معاملہ بندی ابتذال کے ڈانڈوں سے جا ملتی ہے۔ اور اشعار میں "عریانیت" کا وحشیانہ پن در آتا ہے ——— !

جرأت کی طبیعت، غزل کے لئے بہت ہی مناسب تھی ——— مگر افسوس ان کی غزل میں "چوما چاٹی" داخل ہو گئی ——— اور ان کا عشق، صحیح عشق نہ رہا۔ اس کی قندیلیں ماند پڑ گئیں۔ جرأت بھٹک گئے اور انہوں نے ہوسناکیوں سے ناطہ جوڑ کر مادی اور ادنیٰ عشق کو گلے لگا لیا۔

حسرت موہانی انتخاب دیوانِ جرأت کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:-

"جرأت کا کلام سادگی زبان کے ساتھ حسن و عشق کے معاملات سے لبریز ہے مگر ایسا عشق جس کو ہوس پرستی کے سوا اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا، تاہم اس سے ان کے کمال فن میں کوئی نقص پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خوبی و صداقت لازم و ملزوم ہیں ——— جن جذبات کی تصویر جرأت نے کھینچی ہے۔ ان کے حیوانی اور نفسانی ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن چونکہ یہ تصویریں بالکل صحیح کھینچی گئی ہیں۔ اس لئے اہلِ نظر اس کے حسن کی ستائش پر مجبور ہو جاتے ہیں"۔

نمونہ کلام (میر حسن)

کیا جانیے کرشمہ کسے کیا صبح کر گئی ‎ ‎ ‎ ‎ اک آہ کھینچ کر جو وہ خاموش رہ گئی

جب تک کہ نہ ہو یار حسنؔ زیست کا کیا لطف ‎ ‎ ‎ ‎ اس طرح کے جینے سے تو بیزار ہوا ہوں

اس عشق میں جو قدم دھریگا ‎ ‎ ‎ ‎ جیتا نہ بچے گا وہ مرے گا
اوّل سے مجھے یہ ہے ہے دونا ‎ ‎ ‎ ‎ آخر کو یہ درد کیا کرے گا

گر ہجر کی شب یوں ہے حسن تو — رو رو کے تو اپنے دن بھریگا

عشق کب تک آگ سینے میں مرے بھڑکائے گا — دل کو تو اب ہو چکا کیا خاک اب سلگائے گا
لے چلی ہے اب تو قسمت تیرے کوچے سے ہمیں — دیکھئے پھر بھی خدا اس طرف ہم کو لائے گا
گر چلے صحرا میں وحشت پھر چلے گلیوں میں ہم — دیکھئے اب کام ہم کو عشق کیا فرمائے گا
تو گرفتاری کے باعث مضطرب صیاد ہوں — لگتے لگتے جی قفس یاں بھی مرا لگ جائے گا
دم کی آمد شد بھی تک دلیل ہے لے میری جان — تو اگر یاں سے گیا تو پھر یہاں کون آئے گا
اب تو کرتا ہے حسن کو قتل یوں تو بے گناہ — دیکھیو پر کوئی دم میں ہی بہت پچھتائے گا

نہیں کچھ آپ سے اس آستاں سے دور جاتا ہوں — لئے جاتی ہے قسمت کیا کروں مجبور جاتا ہوں
خبر ہے تیرا میرے حال سے غافل نہ رہنا تو! — خدا جانے کہ کیا ہے کیا نہیں رنجور جاتا ہوں
ابھی آیا تھا اور تو ابھی کہنے لگا اٹھ جا! — اگر میرا ہی جانا ہے تجھے منظور جاتا ہوں
گلی میں اس کی آمد شد حسن غم سے نہیں خالی — دل پر درد آتا ہوں سر پر شور جاتا ہوں

ہے صبح سے تا شام ترے نام کو جپنا — اور شام سے تا صبح غم و درد ہیں کھپنا
اس شوخ کے جلنے سے عجب حال ہے میرا — جیسے کوئی بھولے ہوتے پھرتا ہے گھر اپنا
پوچھو نہیں غیر سے گرمی حسن اس کی! — جو ابر رلا دیگا مجھے خوب یہ تپنا

نمونہ کلام (مصحفی)

ہے جام طرب ساغر پر خوں مرے آگے — ساقی تو پلا بادۂ گلگوں مرے آگے
تک لب مجھے ہلا دینے ہیں حسام عجب ہم کا — ہو جاوے گا احوال دگرگوں مرے آگے
سمجھوں ہوں اسے مہرۂ بازیچہ طفلاں — کس کام کا ہے گنبد گردوں مرے آگے

جب تیشے پہ آتا ہے میرا توسنِ خامہ — بن جاویں ہیں تب کوہ بھی ہاموں میرے آگے
میں گوز سمجھتا ہوں سدا اس کی صدا کو — گو بول اُٹھے آدھی کے پچوں پچوں میرے آگے
قدرت ہے خدا کی کہ ہوئے آج وہ شاعر — طفل ہیں جو کرتے تھے غاں غوں میرے آگے
سب خوشہ ربا ہیں میرے خرمن کے جہاں میں — کیا شعر پڑھے گا کوئی موزوں میرے آگے
موسیٰ کا عصا مصحفیؔ ہے خامہ میرا بھی — گو خصم ہے اسود افیوں میرے آگے

نظر آتے ہیں پردے تیری آنکھوں کے گلابی سے
کہیں سے پی ہے تو نے یا اٹھا ہے نیم خوابی سے

سوچے تھا اہلِ جرم سے کس کو کروں میں قتل
اتنے میں اس کو یاد مرا نام آگیا

چمکی بجلی سی پر نہ سمجھے ہم
حُسن تھا یا جمال تھا کیا تھا

رونے پہ مرے جو تم ہنسو ہو
یہ کون سی بات ہے ہنسی کی

کبھو تک کے در کو کھڑے رہے کبھی آہ بھر کے چلے گئے
ترے کوچے میں اگر آئے بھی تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے

آنکھوں میں اس کی میں نے جو تصویر کھینچ لی
سرمے نے اس کی چشم کی شمشیر کھینچ لی

شیشۂ مے کی طرح اے ساقی
چھیڑو مت کہ بھرے بیٹھے ہیں

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

تم رات وعدہ کر کے جو ہم سے چلے گئے
پھر بخت سے خواب میں بھی نہ آئے بھلے گئے

جو پھرا کے منہ کو اس نے بقفا نقاب الٹا
ادھر آسمان الٹا ادھر آفتاب الٹا
میں عجب رسم دیکھی کہ بروز عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

نمونۂ کلام

(انشاؔ) ولیت کے اثرات

جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا
لگا کے برف میں ساقی صراحی مے لا

نکل کے وادیٔ وحشت سے دیکھ اے مجنوں
کہ زور دھوم سے آتا ہے ناقۂ لیلےٰ

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر؟
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

گالی سہی، ادا سہی، چینِ جبیں سہی
یہ سب سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی
گر نازنیں کہے سے بُرا مانتے ہیں آپ
میری طرف تو دیکھئے میں نازنیں سہی

نزاکت اس گلِ رعنا کی دیکھیو انشاؔ　　نسیمِ صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

لکھنویت کے اثرات (انشاؔ)

رہ فضیلت نہ ہو چلوں تو مجھے چھوڑنے دے　　دیکھ یہ جاگہ ہے بے پردہ مرے ہونٹ نہ چوس

چمک ہے یہ کچھ اُس دوپٹہ کی کناری میں　　نظر جوں برق آوے دامن ابر بہاری میں
مجھے کہنے لگے وہ پیار میں آ کر اگر بس ہو　　تو تجھ کو موندھ رکھوں ایک ننھی سی پٹاری میں

اے شوخ پری چہرہ عجب لطف ہو جس دم　　ہیں ہونٹ تمہے چوسوں تو ہونٹ مرے بھی چوسے

کچھ اشارہ جو کیا ہم نے ملاقات کے وقت　　ٹال کر کہنے لگے دن ہے ابھی رات کے وقت
آوے خاطر میں جان آپ پھرا کیجے یوں　　پاس اس بندہ کے آ بیٹھیے پر اس بات کے وقت

گل فلیل سے ابرو کی دل کے داغ کو چوٹ　　پڑا ایسے کہ لگے تڑپنے جیسے زاغ کو چوٹ

جو بھیجا ابر کو دریا نے تار پاٹ کا جوڑا　　تو وہاں بجلی نے طوفان اور بہی گھر گھاٹ کا جوڑا

واں جھوٹ موٹ تم نے بناوٹ سے غش کیا　　ہم سچ مچ ایسے روئے کہ یاں چٹ سے غش کیا

یہ جو مہنت بیٹھے ہیں رادھا کے کنڈ پر　　اوتار بن کے گرتے ہیں پریوں کے جھنڈ پر
شو کے گلے سے پاربتی جی لپٹ گئیں　　کیا ہی بہار آج ہے برہما کے کنڈ پر
راجہ جی ایک جوگی کے چیلے پہ غش ہیں آپ　　عاشق ہوئے ہیں واہ عجب لنڈ منڈ پر

جی چاہتا ہے شیخ کی پگڑی اتاریے　　اور تان کر چٹاخ سے اک دھول ماریے
ہے شیخ سیہ چہرہ جو مجلس میں پھدکتا　　یاروں کو یہاں روتے ٹھٹھول کی سوجھی
یہ جو بڑھا سا ہے دربان تمہارا اے کاش　　کوئی چوہڑا آوے اور اس کی کوئی گردن مارے

نمونۂ کلام (رنگینؔ)

جب جی سے ترے اتر گئے ہم — بھر کر ایک آہ مر گئے ہم
وحشت نہیں دشمنوں کی ہم کو — سر اپنے سے جب گزر گئے ہم
جا غیر کے گھر میں اس کو پایا — قدموں کے جو کھوج پر گئے ہم
دریا بھی بجھا سکا نہ رنگینؔ — جلتا جو تھے جگر گئے ہم

رہا نہ ہاتھ میں دل، ہم نے اس کی چلون سے
وہ گول گول جو باہر کلائیاں دیکھیں

میرے منہ پاس منہ لایا تو ہوتا
نہ دیتا بوسہ بہکایا تو ہوتا!

گئے زانو پہ میرے وہ جو سو تو یہ بولے چونک کے دور ہو
کہوں صدقے میں ایسے تکیے کو میری گردن اس سے اکڑا گئی

وہ بھی تو دن تھے کہ تم رہتے تھے ہمسایہ میں
اب تو بدک جاتے ہو دیکھ کے پرچھائیاں
جو ہے میری آرزو جانتے ہو اس کو تم
کیوں یہ سمجھ بوجھ کر کرتے ہو چھلائیاں

گل سے رخ تے نگار بہتر ہے — سرو سے قد یار بہتر ہے
ٹپکی پڑتی ہے اس سے نکھراہٹ — ہے یہ عالم تری جوانی کا

میں نے کہا کہ ہجر کی طاقت نہیں مجھے — گھر چلیے میرے اب جو میرے دوستدار ہو
ہنس ہنس کے دیکھ دیکھ کے میری طرف کہا — یہ بات جا کے اس سے کہو جس کے یار ہو

غم نہیں مرنے کا اپنے مجھے یہ سوچ ہے آہ — کون اٹھا دیگا تیرے جور و جفا میرے بعد

آپ پھر کل لگانے بتانے آج — ہو تے کافر جو کل کر مانے آج
جھوٹ وعدہ ہمیشہ کرتے ہو — سچے ہو جاتے تو جانیں آج؟
ہم نے چٹکی جو لی تو ہو کے خفا — بولے آئے ہو کیوں ستانے آج
روز تم چپکے بیٹھے رہتے تھے — کیا ہوا ہے تمہیں نہ جانے آج
بولے گھر جائیں گے اکہا میں نے — چپ رہو مت کرو بہانے آج
کل تلک ہوشیار کہتے تھے — مجھ کو پاگل لگے بتانے آج

چھپاؤ مت کہے دیتا ہے سب چہرے کا اترا پن
کہیں تو رات کو جاگے ہیں صاحب کیوں مکرتے ہیں

نہ اپنے میں نہ بیگانے میں دیکھا — جو رشتہ شمع پروانے میں دیکھا
نہ مسجد میں نہ بت خانے میں دیکھا — جو جلوہ دل کے کاشانے میں دیکھا

ہے یہ دنیا جائے عبرت خاک سے انسان کی بھی — بن گئے کتنے سبو اور کتنے پیمانے ہوئے

سایہ طوبیٰ میں جا کر بیٹھو تم شیخ جی — یار تو اب ڈھونڈتے ہیں تاک کے سایے تلے

نمونہ کلام (جرأت)

اس پردہ نشیں سے کوئی کس طرح بر آئے جو خواب میں بھی آئے تو منہ ڈھانک کے آئے

پڑے ہے بزم میں جس شخص پہ نگاہ تیری وہ منہ چھپا کے کہتا ہے اُف پناہ تیری

کیونکہ تم پاس سے ہم جائیں بھلا اور کہیں جی تو لگتا ہی نہیں یاں کے سوا اور کہیں

جگاؤں میں جو سوتے سے تو کیا برہم ہو کہتا ہے خدا جانے اٹھے ہیں آج ہم منہ دیکھ کر کس کا

یاد کیا آتا ہے وہ میرا لگ جانا اور آہ پیچھے ہٹ کر اس کا یہ کہنا کوئی آجائے گا

جب تلک ہم نہ چاہتے تھے تجھے تب تلک ایسا ترا جمال نہ تھا

جب یہ سنتے ہیں وہ ہمسائے میں ہیں آئے ہوئے کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے

جی کی جی میں مری رہ جائے گی بات گر شب وصل میں شرمائیے گا

لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں!
کیا رک سکے وہ جس کے ہے جو تلک اس سے لگ چلوں بس بس پرے ہو شوق یہ اپنے تئیں نہیں

ہووے کس منہ سے بیاں وہ کہ دم بوس و کنار کہنا کہ جس ادا سے وہ بس بس ہے بس کی

بیٹھا ہو وصل میں ٹک لطف اٹھانے دے مجھے — اے ترے پاؤں پڑوں ہاتھ لگانے دے مجھے
انگلیاں پاؤں کی اب اپنے وہ دبوائے ہے — کچھ تو رہنے دے پاس ادب ہاتھ بڑھانے دے مجھے

کوئی یاں اس کو لے آوے بلا کے — بہانے سے کسی اور آشنا کے
غضب ہے لیتے ہی آغوش میں ہائے — وہ اس کا سانس لینا کسمسا کے

ہمیں دیکھے سے وہ جیتا تھا اور ہم اس پہ مرتے تھے — یہی راتیں تھیں اور باتیں تھیں وہ دن کیا گزرتے تھے

گر وہ ہاتھ آئیں تو زانو پہ بٹھائے رکھئے — لب سے لب سینے سے سینے کو ملائے رکھئے
بس میں وہ پردہ نشیں اپنے گر آجائے تو بس — کنج خلوت میں اسے سب سے چھپائے رکھئے
اور بخت اپنے جو بیدار ہوں تو آٹھ پہر — کیا ہی لپٹا کے گلے ساتھ سلائے رکھئے

بیٹھیں کیا دور کہ چاہے ہے یہی کثرت شوق — آپ کے زانو سے زانو کو بھڑائے رکھئے

کہاں ہے گل میں صفائی ترے بدن کی سی — بھری سہاگ کی سی تس پہ یہ بو دلہن کی سی

دوڑ دوڑ آنے سے جرأت کے رکو مت کیا کہیے — اس بچارے کی طبیعت تم پہ ہے آتی ہوئی

شب تری زلفوں کی حکایات ہے واللہ — کیا رات ہے کیا رات ہے کیا رات ہے واللہ
جرأت کی غزل جس نے سنی اس نے کہا داد — کیا بات ہے کیا بات ہے کیا بات ہے واللہ

اپنے پہلو سے جب وہ اُٹھ کے چلا اُسے جرأت — اُس کا منہ دیکھ کے بس رہ گئے مجبور سے ہم

آرام نہ ہو دل کو تو اے یار کیا کریں — پھر پھر کے یہیں آتے ہیں ناچار کیا کریں
صیاد نہ کر منع کہ گلشن کی ہوس ہیں — تڑپیں نہ تو یہ مرغِ گرفتار کیا کریں
احوال کہے بن نہیں بنتی ہے کس طرح — اور کہیئے تو وہ ہوتا ہے بیزار کیا کریں

شب وصل میں تعلق تھا یہ وہ سو گیا تو منہ سے — نہ ذرا بھی ہیں وہ پڑ بسبب حجاب اُلٹا
طلب اس سے کل جو مے کی تو بھرا ہوا زمین پر — مجھے شوخ نے دکھا کر قدح شراب الٹا

شب فرقت کی حقیقت کوئی کیا جانے ہے — جس خرابی سے کٹی رات خدا جانے ہے

پڑے ہے بزم میں جس شخص پہ نگاہ تیری — وہ منہ کھسیا کے کہتا ہے اُف پناہ تیری

کل تم نہ تھے تو رات تھی پیارے بلا طویل — اب ہو تو دیکھ لیجو دم میں سحر ہے آج

پہلے تو از راہ اُلفت گھر بلایا آپ نے — بھر گیا جب دل تو پھر در در پھرایا آپ نے

اس دور میں غزل کا جو شاعر بھی اُٹھا، اس نے شعوری طور پر "لکھنویت" اپنانے کی کوشش کی کیونکہ اس وقت کا معیار یہی تھا۔ اس دور میں غزل کا جو معیار اور اصول مترتب ہوئے، ان کا سلسلہ آتش و ناسخ سے لے کر کم و بیش امانت اور واجد علی شاہ اختر تک پہنچ جاتا ہے۔

آتش اور ناسخ اس دور کے علمبردار ہیں۔ ویسے ان دونوں میں فرق ہے

کیونکہ آتش جذباتیت کے بھی قائل ہیں کہیں کہیں تصوف کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ لیکن ناسخ کے یہاں تمام تر الفاظ کی شعبدہ بازی ہے —— لیکن پھر بھی اس وقت غزل میں جو نئے جہان آتش و ناسخ نے بسائے، وہ ایک ہی نوعیت کے ہیں۔ اور ان کی تعمیر و تشکیل میں دونوں کا حصّہ ہے۔

ناسخ کو اساتذۂ لکھنؤ میں بڑا مرتبہ دیا جاتا ہے کیوں کہ انھوں ہی نے سب سے پہلے دلی اور لکھنؤ کے دبستان شاعری کو مستقل حیثیت سے الگ کیا اور لکھنؤ کی زبان و سخنوری کے قواعد وضوابط ترتیب دیئے۔

ناسخ کے کلام کا بیشتر حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ ان کی غزلیں جذبے اور اثر سے تہی ہیں —— الفاظ کی شان وشوکت اور زبان کی تزئین کی طرف خاص توجہ دی گئی ہے —— "لکھنویت" ان کے یہاں شباب پر ہے۔ ان کی شاعری میں عشق حقیقی کو موضوع نہیں بنایا گیا۔ بلکہ تصنّع ان کا اصلی جوہر ہے۔ غزلیں صائب اور بیدل کے رنگ میں ہیں۔ اور انتہا پسندی نے ان کی غزلوں کو ابتذال کی حد سے ملا دیا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو باوجود اپنی تشبیہات اور شکوہ الفاظ کے ان کی غزلیں تاثرات اور جذبات سے قطعاً عاری ہے —— ان میں صرف ابتذال ہی ابتذال ہے —— !

ناسخ کو زبان پر عبور حاصل ہے۔ اور انھوں نے اصلاح زبان کی طرف خاص توجہ دی ہے۔ وہ صرف زبان کے ہیر پھیر، الفاظ کی تراش خراش اور قواعد پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ مشکل پسندی عزیز ہے —— روح کی تزئین کی بجائے پیکر کی آراستگی کے دلدادہ ہیں۔ الفاظ، ردیف، قافیے کے حسن پر مرتے ہیں۔ اور ان کا صرف انہیں خوب آتا ہے۔ بہت سے شعروں میں عربی فارسی کے الفاظ زیادہ استعمال کئے ہیں۔

اردو غزل میں ناسخ نے کوئی اضافہ نہیں کیا البتہ محاورے اور تشبیہات کے استعمال اور بندش کی چستی میں انہیں کمال حاصل ہے۔ زبان اور فن کی حیثیت سے ناسخ ایک مسلم الثبوت اُستاد ہیں — لکھنؤ کے شعرا میں ان کا بہت اثر تھا — ناسخ کا انداز انہیں تک محدود نہیں رہا۔ بلکہ اوروں نے بھی اس کی تقلید کی۔ اور واجد علی شاہ کے بعد کہیں جا کر اس انداز کا کسی حد تک خاتمہ ہوا۔

نمونۂ کلام (ناسخ)

غیر کوثر کسی دریا کا میں سیّاح نہیں ۔۔۔ بشنۂ شیرِ خدا ہوں کہیں تیراح نہیں
ظلم طولِ شبِ فرقت کے تطاول نے کیا ۔۔۔ داد رس کوئی بجز خالق الاصباح نہیں

بے خطر یوں ہاتھ دوڑاتا ہوں زلفِ یار پر ۔۔۔ دوڑتا تھا جس طرح ثعبانِ موسیٰ مار پر
دیکھو ناسخ سرِ شیخ معمم کی طرف ۔۔۔ کیا کلس مسواک کا ہے گنبدِ دستار پر

دور پھینکا ساقیا لیتے ہی تیرے ہجر میں ۔۔۔ ہاتھ میں جام مئے گلرنگ انگارا ہوا
جب نہانے کو ہوا عریاں وہ پتلا نور کا ۔۔۔ حوض میں روشن برنگِ شمع فوارا ہوا
دوستو جلدی خبر لینا کہیں ناسخ نہ ہو ۔۔۔ قتل آج اس کی گلی میں ایک بیچارا ہوا

سفر ہم نے کیا یادِ لبِ جاناں میں دنیا سے ۔۔۔ چراغ اپنی لحد پر چاہیے لعل بدخشاں کا

پیٹ کے یار سے سوتا ہوں مانگتا ہوں دعا ۔۔۔ کہ میری عمر بسر یا رب ایک کروٹ ہو

تصوّر میں ہے اک انگیا کی چڑیا ۔۔۔ یہ دل گنجشک کا اب آشیاں ہے

رل گیا خاک میں پس پس کے حسینوں پہ میں — قبر میں بوئیں کوئی چیز حنا پیدا ہو

جب روپہلا چوٹی میں موباف ڈالا یار نے — سنبلستانِ گلِ شبّو نظر آیا مجھے!

بو سے بستی ہے ترے بالے کی مچھلی اے صنم — ہے ہمارے دل میں عالم ماہیِ بے آب کا

میرے رونے کے سبب سے قد جاناں بڑھ گیا — خوب جو بارش ہوئی سروِ گلستاں بڑھ گیا

کس قدر صاف ہے تمہارا پیٹ — صاف آئینہ سا ہے سارا پیٹ
پہنے کرتی اگر وہ جالی کی : — کرے ہر حلقہ کو ستارا پیٹ

کیا ترے کفشِ پا میں ہے خوشبو — شبہ ہے نافِ آہوئے چیں کا

ہر اک انگلی ہے اس کی شمعِ کافور — ہتھیلی اک بلوریں شمعدان ہے،
بالے سکے مرتے ہیں تارے لٹتے تاباں آفتاب — تیرے آنے سے ابھی بام، آسماں ہو جائیگا،

آتش بھی ناسخ کی طرح لکھنؤی رنگ کے قصر کا ایک ستون ہیں. لیکن اس کے باوجود ان میں اور ناسخ میں کچھ تضاد ہے ـــــ آتش، مصحفی کے شاگرد تھے، اور اسی لئے ان کے یہاں کہیں کہیں "غزلیت" کے عنصر مل جاتے ہیں. غزل میں کوئی کوئی شعر ایسا بھی مل جاتا ہے جس میں باطنی کیفیت، اور داخلیت کے سائے منجمد ہوتے ہیں ـــــ آتش کا فقر، رندی اور قلندری مشہور ہے. اس کے نتیجے میں، یہ اثرات ان کی غزلوں میں کہیں کہیں نمایاں ہو جاتے ہیں. بعض جگہ تصوف، اور اخلاقی معاملات بھی ان کی غزلوں سے مترشح ہیں. انہوں نے غزل کی روایت

کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے۔

ان کی غزلوں میں ضبط و سکون اور ایک سنبھلی ہوتی سی کیفیت ہے۔ ناسخ کے برعکس الفاظ بھی شیریں اور رس بھرے اپنائے ہیں ـــــ ان کے اندازِ بیان میں جو ولولہ، جوش، بانکپن اور تیکھا پن اور کہیں کہیں جو باطنی کیفیتیں ہیں ، ان سے ان کی حسن کاری اور ذوقِ شعری کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے شعروں میں ان کے دل اور ذہن کا عکس ہے اور جہاں غزل کی روایت رچ گئی ہے وہاں تو اشعار کا کیف اور سرور دوبالا ہو گیا ہے ـــــ اور دل کشی بڑھ گئی ہے ـــــ لیکن ایسے اشعار آتش کی غزلوں میں زیادہ نہیں۔

ان باتوں کے علاوہ آتش کے ہاں رعایت لفظی ، ان کے جذبات سے ہم آہنگ ہو کر ، انہیں صیقل کرتی ہے ـــــ !

آتش کے یہاں تشبیہوں اور تمثیلوں میں تازگی ، نیاپن ، اور طراری ہے۔ اُردو زبان کی اصلاح ، اور اس میں رنگینی نغمگی اور حُسن بھرنے کا کام بھی ان کی ذات کا محتاج ہے۔

نمونہ کلام (آتش)

تُم اندھیری رات میں اُلٹو جو چہرے سے نقاب — روئے اشک مہر ذرّوں کو جگا دے خواب سے

بہارِ لالہ و گُل سے لگی ہے آگ گلشن میں — گریباں پھاڑ کر چل بیٹھیے صحرا کے دامن میں

رنگ بدلتا نظر آتا ہے ہوا کا مجھ کو — گُل تازہ کوئی اس باغ میں خنداں ہوگا

بیان خواب کی طرح جو کر رہا ہے یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

حسن پری ایک جلوۂ مستانہ ہے اس کا ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اس کا
شکرانۂ ساقی ازل کرتا ہے آتش لبریز مئے شوق ہے پیمانہ ہے اس کا

شب ہجراں میں جو دم تھا وہ گویا واپسیں دم تھا گماں تھا شام سے مجھ پر چراغ صبح گاہی کا

آنکھوں سے جائے اشک ٹپکنے لگا لہو آتش جگر کو دل کی مصیبت نے خون کیا

سمجھایا نہ اسے آتش سمجھا! دِل مضطر کو سمجھایا تو ہوتا

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوئے میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا دکھلاتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

موت ہی آئے جو آنسو نہیں تھمتے یارب دامن خاک ہی اس دیدۂ تر تک پہنچے

صوفیوں کو وجد میں لاتا ہے نغمہ ساز کا شبہ ہو جاتا ہے پردے سے تری آواز کا

طور سے کیا کیا تجلی نے حسن بے پردہ سے حذر ہے شرط

یقین ہے اٹھے گی جان اپنی آ کے گردن میں
سنا ہے جاپہے قریب رگِ گلو تیری

عدم سے جانبِ ہستی تلاش یار میں آئے
ہوائے گل سے ہم کس وادیٔ پُرخار میں آئے

معرفت میں تیری ذات پاک کے
اڑتے ہیں ہوش و حواس ادراک کے

آتش کی غزلوں میں ایسے اثرات کی کثرت ہے۔

کسی کی محرمِ آبِ رواں کی یاد آئی
حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا

دریا میں غسل کے لئے اترا جو وہ صنم
ناقوس مچھلیوں نے بجایا حباب کا

شادیٔ وصل میں جامے سے ہوں باہر ہوں وہ
ہیں برہنہ اسے دیکھوں تو وہ عریاں مجھ کر

کریں گے یار کو عریاں شبِ وصل
عیاں ہو جائے گا رازِ نہانی

کھینچ کر تیغ کمر سے کسے دکھلاتے ہو
نافِ معشوق نہیں ہوں جو میں ٹل جاؤنگا

رنگِ طلائی رکھتا ہے اندام یار کا
موئے کمر کو رتبہ ہے سونے کے تار کا

شیریں لبوں کے اوپر رال اپنی ہے ٹپکتی
بوسے کا نام سن کر ہم منہ پسارتے ہیں

گورے منہ کی تری یاد آئی سنہری افشاں
لوحِ سیمیں پہ اگر کام طلا کا دیکھا

آتش اور ناسخ نے مل کر غزل کے لکھنؤ انداز کا جو ماحول تیار کیا تھا اسے ان شاگردوں نے خاص طور پر قائم رکھا —— بعد کے غزل گو شعرا میں اس انداز کو سنبھالنے والوں میں رندؔ، صباؔ، وزیرؔ، برقؔ، اشکؔ، اسیرؔ، تعشقؔ، امانتؔ اور واجد علی شاہ شامل ہیں —— یہ سب صاحبِ دیوان ہیں۔

نمونہ کلام

(رند)

کھولتے شوق سے بند انگیا کے　　　　ہٹ کے ساتھ نہ شرمایئے آپ

وصل کی شب بھی کہ دم عریاں کرینگے انکو ہم　　　　ایک دن واعقدہ ناف و کمر ہو جائیگا

رشک بلقیس بنایا ہے خدا نے تجھ کو　　　　بدلوں خاتم سے سلیمان کی نہ چھلا تیرا

واہ بے اس پری کے تکمہ رچو خال ہے　　　　عالم ہے اس کی جالی کی کرتی پہ جال کا

پڑی جان اڑنے لگا میرے کبوتر جیسے　　　　روئی کا جو تو نے کبوتر بنالیا

(صبا)

ہاتھ عناب لب و سیب ذقن تک پہنچا　　　　ہم نے میوہ چمن حسن سے توڑا کیا کیا

بوسہ دے کر وہ صبا کہتے ہیں　　　　یاد رکھے گا یہ احسان مرا

لگ کہنے لگے کندن پر چڑھا ہے مینا　　　　سبزۂ خط سے وہ خوش رنگ ترا گال ہوا

کولھو میں گردش نگہ یار سے پسا　　　　تل تیل ہو کے بہ گیا چشم غزال کا

سحر وصل کی مانگوں جو دعا　　　　چور کر دے شب ہجراں میرا

(وزیر)

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو　　　　کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

ہاتھ اس انگیا کی چڑیا تک پہنچ سکتا نہیں　　　　دام میں لاؤں دکھا کر دانہ زنجیر کو

خواب میں دست تصور بھی کبھی محروم نہیں　　　　اے پری عنقا ہے انگیا کی چڑیا کم نہیں

لڑائی وصل میں اس جنگجو سے ہونیوالی ہے　　　　کٹاری گلبدن کے پائجامے نے نکالی ہے

وصل میں رفتار معشوقانہ دکھلاتی ہے نیند　　　　آج کن اٹکھیلیوں سے آنکھوں میں آتی ہے نیند

(برق)

دکھائی دل کو ترے رخ نے وہ فصل بہار حسن　　　　مو باف زلف کا شفق شام ہو گیا

جھک جاتی ہے چلنے میں کمر بار سے پستان — نازک ہے شجر، بوجھ کمر کا نہیں اٹھتا
چاندنی بن گئی کرتی جو نہا کر پہنی — کاج کے پھول ہوئے ان کے بدن میں مہتاب
شعلے اُٹھے جو آتشِ رُخسارِ یار سے — پانی کی مچھلیوں کو سمندر بنا دیا!
جمع کرتے ہیں خدم میل کو، تولوں ماشوں — مشک ہوتا ہے دمِ غسل بدن سے پیدا

(رشک)

دل مانگتا ہے وہ اس ہنسی سے — دیکھتے ہیں آئینہ ہمارا
بس عمر بھر لپٹ کے نہ سویا کسی کیساتھ — صدمانہ ہوگا گور میں مجھ کو فشار کا
مجھ کو سوختی دیکھ کے کہتا ہے بزم میں — اپنے چمن میں کام نہیں ہے چنار کا
پہن کے ڈول کے کپڑے نہ ٹالتے وعدہ — ہمیں پسند نہیں ٹال ٹول کی باتیں:
کہیے پستاں کو گر انار تو ہے — جلدِ پستان، انار کا چھلکا!

(بحر)

دوپٹے کو آگے سے دوہرا نہ اوڑھو — نمودار چیزیں چھپانے سے حاصل
حُسن نکلیں کو لے کے چپاتیں — جب اپنی ہی زیبت بے مزا ہو
حُسنِ روز افزوں نے گنجائش نہ پائی جسم میں — بن گیا انگیا کے پردے میں سمٹ کر چھاتیاں
نشۂ جوشِ جوانی یار کو ایسا چڑھے — توڑ کر بند کر اپنے جامے سے ہوں باہر چھاتیاں
کیا کہوں اے بحر آب و تاب اس گُلِ جسم کی — پیٹ ہے کوثر، حباب آبِ کوثر، چھاتیاں

(اسیر)

دل ہمارا تھا حسینوں اب تمہارا ہوگیا — ملک یہ آخر امانی سے اجارہ ہوگیا
گل ہوا غنچہ جو بو جامے سے باہر ہوگئی — دل ہوا زخمی اگر راز آشکارا ہوگیا
کاتبِ قدرت ہوئے خود بیو رعبِ حسن سے — مصرعِ آبرو رقم اس سے دوبارہ ہوگیا
وہاں یار کا مضمون نشہ میں سوجھا — چراغِ راہ قدم ساغرِ شراب ہوا،

کہاں کہاں نہ ہوا میرے مرگ سے ماتم — اسیر خانہ زنجیر تک خراب ہوا

(قلقؔ)

سوتے ہیں پھول پھول کے سارے پلنگ پر — ہم چپ الگ پڑے ہیں کنارے پلنگ پر

قسمت سے آگے وصل میسر ہوا نہ ہو — آئے تو منتوں سے وہ بارے پلنگ پر

باہر ہوا ہیں جامے سے اپنے شب وصال — کپڑے جو اس نے اپنے اتارے پلنگ پر

(امانتؔ)

ہٹ گئے ساقین جاناں سے جو شب کو پائنچے — اک وہ شاخہ نور کا محفل میں روشن ہو گیا

دوپٹہ اوڑھ کر آب رواں کا سرخ انگیا پر — دکھایا باغ میں اس گلبدن نے خوب شبنم کو

اکیلے گھر میں جو میں اس سے دوڑ کر لپٹا — کہا کہ ہٹ در و دیوار و بام دیکھتے ہیں

وصل کی شب پلنگ کے اوپر — مثل چلتے کے وہ مچلتے ہیں،

یہ سب شعرا لکھنوی دبستان کے عام رنگ کے ترجمان ہیں۔ ان میں ابتذال، رکاکت اور معاملہ بندی وغیرہ کے سوا اور کچھ نہیں —— جنسی معاملات اور ذہنی تعیش کی عکاسی کرتے ہیں — آتش اور ناسخ کا دور لکھنوی غزل کے شباب کا زمانہ ہے۔ اس وقت لوگ لکھنو ہی کو اردو شاعری کا ملجا سمجھتے تھے —— لیکن اسی زمانے میں (انیسویں صدی کا آخر) دلّی کی محفلوں کے کھنڈروں میں ایکبار پھر نئی مجلسیں قائم ہوئیں —— اور غالب، مومن، ذوق، شیفتہ اور بہادر شاہ ظفر نے غزل کے ٹوٹتے ہوتے جسم کو سنبھالا۔ اپنے جگر اور دل کی حدت سے اس کے حسن کو جلا بخشی اور غزل پھر سے حقیقت میں غزل بن گئی —— "دبستان دلّی" پھر سے پھلنے پھولنے لگا۔

میرزا غالب اس زمانے کے سب سے بڑے غزل گو شاعر ہیں۔ اور متغزلین میں ان کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ میر سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ غالب کے

ہاتھوں غزل میں وسعت اور کشادگی پیدا ہوتی ہے۔
غالب غزل کے جدید دور کے پیشرو ہیں۔ وہ غزل کو آگے بڑھاتے ہیں اور نئے مضامین، اور تازہ افکار سے اس کا دامن بھر دیتے ہیں —— ان کی آمد کے ساتھ ہی غم کے وہ منجمد راستے جن پر سے میر گزرے تھے۔ شہنائیوں کی میٹھی میٹھی آوازوں سے پگھل کر جگمگا اٹھتے ہیں۔
غالب اس دنیا میں نئے ولولے نئی امنگیں، اور نئے جوش لے کر آئے تھے —— اور اسی لئے انہوں نے اپنا ذہن، اپنا جگر، اور اپنا دل، سب کچھ نچوڑ کر غزل کو سونپ دیا۔ اور پھر غزل اس قدر نکھری کہ آنکھیں تک چندھیا گئیں۔ اس ہوشمند فنکار کے غزل پر بہت سے احسان ہیں —— انہوں نے نہ صرف غزل کی روایات کا احترام کیا ہے۔ بلکہ اسے بہت ہی آگے بڑھا کے بھی رکھ دیا ہے —— ان کے لبوں سے اشعار نہیں پھول جھڑتے ہیں —— اور پھول بھی ایسے جو سدا بہار ہیں — ان کے بولوں میں سحر ہے، تازگی ہے، شگفتگی ہے، رعنائی ہے۔ ملائمیت ہے۔ اور جدت ہے —— حلاوت اور نمکینیت کے گھلے ملے ایسے نادر نمونے ہیں۔ جن کی مثال مشکل ہی سے ملتی ہے
ان کے ہاں مزاج اور غم کا حسین امتزاج ہے —— تجمل اور غنائیت نے اجالا سا کر دیا ہے۔ —— غالب نے اگر ایک طرف غزل کے پیکر کو رسیلے الفاظ، اور اپنی جدت طرازیوں سے تزئین کی ہے تو دوسری طرف تڑپ تڑپ کر اس کی خوابیدہ روح کو جگایا ہے —— وہ غزل کی آنکھوں کے حسین پیالوں میں مے پیش کرتے ہیں —— غزل کی وہ دوشیزہ جو جنوبی ہند (دکن) سے لالہ کے پھولوں کی سرخی، نقرئی چاندنی کا نکھار اور نیلگوں پانیوں کی نمکینیت لے کر جوہی کی ڈال کی مانند لچکتی ہوئی شمالی ہند آئی تھی، اب ایک حور بن گئی — حور بھی ایسی

جیسے کسی غلطی کی پاداش میں آسمانوں سے نکال دیا گیا ہے اور جو بڑی حسین بڑی سندر اور بڑی ہی سروپ ہے —— اور اپنی نرم نشیلی سانسوں سے اس کائنات کو مہکا رہی ہے۔ غالبؔ کی غزل، جیسے فضاؤں میں ترنم کے جزیرے بہہ رہے ہیں۔

غالبؔ کی غزلوں میں حسن وعشق بھی ہے۔ تصوف اور فلسفہ بھی۔ انہوں نے سماجی حالات اور تہذیبی معاملات کی پورے خلوص اور بھرپور جذبے کے ساتھ عکاسی کی ہے —— ان میں حیات و کائنات کے مسائل کا بیان بھی ہے۔ غالبؔ کے یہاں دردِ وخستگی کم ہے —— قنوطیت کی بجائے وہ رجائیت کا پیغام دیتے ہیں۔ جینے کا ڈھنگ سکھاتے ہیں —— وہ خوشیوں کے جویا ہیں اور خوشیاں ہی بانٹنا چاہتے ہیں۔

وقت کے گہرے اور دبیز سناٹوں اور ٹوٹتی ہوتی تاریکیوں اور برستے ہوئے مصائب میں بھی وہ مایوس نہیں ہوتے —— رنج ومحن کے گھور اندھیرے جب یکجا ہو کر ان کی طرف بڑھتے ہیں تو وہ مسکرا کر انہیں ایسی نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ وہ سمٹ کر بعید گوشوں میں معدوم ہو جاتے ہیں ——!

غالبؔ کے اشعار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جی سے نہیں اترتے غزل کی روایات کے رچاؤ کے ساتھ ساتھ ان میں کوئی ایسا سحر پنہاں ہے، کہ جس کا اثر دھیما ہی نہیں پڑتا —— ان اشعار کو جتنی مرتبہ پڑھا جائے۔ ان کا نشہ تیز سے تیز تر ہوتا جاتا ہے —— ان کا کلام عالمگیر ہے۔ رفعتِ تخیل کے لحاظ سے اردو کا کوئی شاعر ان کے مرتبہ کو نہیں پہنچا۔ غالبؔ کے خیالات صدیوں تک فرسودہ نہ ہوں گے۔ اور اسی میں ان کے کلام کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز ہے۔ اردو غزل کے اس دور (غالبؔ وغیرہ کا) کو سنہری کہہ سکتے ہیں —— کیوں کہ اس دور نے نہ صرف غزل میں وسعت پیدا کی۔

بلکہ اسے عروج پر پہنچا کر اور بھی آگے بڑھا دیا
اس سے دور کو ہم جدید دور کا پہلا موڑ بھی کہہ سکتے ہیں۔

نمونۂ کلام (غالب)

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

وہ بدخو اور میری داستانِ عشق طولانی
عبارت مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

ادھر وہ بدگمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

تکلف برطرف، نظارگی میں بھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

آگہی، دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا!

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا — اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا!
ترے وعدے پر جئے ہم، تو یہ جان جھوٹ جانا — کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا — کبھی تو نہ توڑ سکتا، اگر استوار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو — یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا؟
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح — کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا
رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا — جسے غم سمجھ رہے ہو، یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے — غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بری بلا ہے — مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا؟ — نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا
اسے کون دیکھ سکتا، کہ یگانہ ہے وہ یکتا؟ — جو دوئی کی بو بھی ہوتی، تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا! — میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا!
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟ — اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں؟ — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب! کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا،
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟ — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا۔
جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما — کام گر رک گیا روا نہ ہوا

رہزنی ہے، کہ دل ستانی ہے؟
لے کے دل، دل ستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

گھر ہمارا، جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر اگر بحر نہ ہوتا، تو بیاباں ہوتا

تنگیِ دل کا گلہ کیا، یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

بعدِ یک عمرِ ورع، بار تو دیتا، بارے
کاش، رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا؟

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا!
نہ ہوتا گر جدا تن سے، تو زانو پر دھرا ہوتا

ہوئی مدت کہ غالبؔ مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا، کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا؟

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا!
دل، جگر تشنۂ فریاد آیا!

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

سادگی ہائے تمنا، یعنی!
پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا

عذرِ واماندگی اے حسرتِ دل
نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا!

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا!

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں
دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا

پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا!

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

ہے بس کہ ہر اک انکے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت، تو گزرتا ہے گماں اور

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ابرو سے ہے کیا اس نگہِ ناز کو پیوند
ہے تیر مقرر، مگر اس کی ہے کماں اور

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خوں نابہ فشاں اور

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"

لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

لیتا نہ اگر دل تمہیں دیتا کوئی دم چین
کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں؟

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں؟

جب وہ جمالِ دل فروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں؟

دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رُخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں؟

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

حُسن اور اس پہ حُسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں؟

واں وہ غرورِ عزّ و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں؟ بزم میں وہ بلائے کیوں؟

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؟

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا؟ کیجیے ہائے ہائے کیوں؟

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی؟
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خون کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں؟
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

دلِ ناداں تجھے ہُوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

ہم ہیں مُشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

میں بھی مُنہ میں زباں رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ "مدّعا کیا ہے؟"

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجُود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
غمزۂ و عشوہ و ادا کیا ہے؟

شکنِ زُلفِ عنبریں کیوں ہے؟
نگہِ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے؟

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟

ہم کو ان سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا
اور درویش کی صدا کیا ہے؟

جان تم پر نثار کرتا ہُوں
میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے؟

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے؟

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

جز نام نہیں صُورتِ عالم مجھے منظُور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے ‏— تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے
سچ کہتے ہو خودبین و خودآرا ہوں نہ کیوں ہوں ‏— بیٹھا ہے بت آئنہ سیما مرے آگے
پھر دیکھیے انداز گل افشانی گفتار ‏— رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے
نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا ‏— کیوں کر کہوں لو نام نہ اُن کا مرے آگے
ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر ‏— کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے
عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام ‏— مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلا مرے آگے
خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے ‏— آئی ہے شب ہجراں کی تمنا مرے آگے
ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو ‏— آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے
گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے ‏— رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالب کو بُرا کیوں کہو اچھا مرے آگے

مُدت ہُوئی ہے یار کو مہماں کیے ہُوئے ‏— جوش قدح سے بزم چراغاں کیے ہُوئے
کرتا ہُوں جمع پھر جگر لخت لخت کو ‏— عرصہ ہُوا ہے دعوت مژگاں کیے ہُوئے
پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم ‏— برسوں ہُوئے ہیں چاک گریباں کیے ہُوئے
پھر گرم نالہ ہائے شرربار ہے نفس ‏— مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کیے ہُوئے
پھر پرسش جراحتِ دل کو چلا ہے عشق ‏— سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہُوئے
پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بخون دل ‏— سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہُوئے
دِل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے ‏— پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہُوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس ‏— زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہُوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن ‏— بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہُوئے

غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

غالبؔ کے ساتھ ساتھ مومنؔ، ظفرؔ، شیفتہؔ وغیرہ نے بھی غزل کی آرائش میں حصہ لیا ہے اور اس میں جدت کے رنگ بھرے ہیں —— مومنؔ عاشقانہ رنگ کے اُستاد کامل ہیں۔ ان کی غزلیں نازک خیالی اور صحیح جذبات نگاری کی مظہر ہیں —— اور رنگ تغزل سے بھرپور ہے۔

اس دور میں یہ نوزائیدہ محفلیں غدر تک قائم رہیں اور اس کے بعد غدر کا سیلاب انہیں بہا کر لے گیا —— اور ان محفلوں کے کھنڈرات بھی پہلے خرابے کے ساتھ جا ملے —— دلی کے شاعروں کی قسمت میں سکون ہی نہیں تھا۔ وہ پہلے کی طرح دلی کو چھوڑ کر ادھر ادھر چل دیئے۔

غدر کے ہنگاموں کے سبب دلی اور لکھنؤ کے کتنے ہی شاعر ریاست رامپور چلے گئے —— اور یہاں ایک ایسی محفل کی تشکیل ہوئی جس میں داخلی (دبستان دلی) اور خارجی (دبستان لکھنؤ) دونوں پہلوؤں پر توجہ دی جانے لگی —— غزل کی روایت کا بھرم بھی قائم رہا ——!

رامپور کے ان شعرا میں داغؔ، امیر مینائیؔ، جلالؔ اور تسلیمؔ کے نام قابل ذکر ہیں —— وقت کی بے وفائی دیکھئے، ان شعرا کی رامپور بھی زیادہ عرصے تک سرپرستی نہ کر سکا اور یہ لوگ پھر منتشر ہو گئے —— داغ حیدرآباد دکن چلے گئے تھے انکی موت بھی وہیں واقع ہوئی اسی سبب سے یہ حیدرآباد دربار کے شاعر بھی کہلاتے ہیں —— امیر مینائی نے بھی کچھ عرصے بعد اسی دیار کا رُخ کر لیا تھا ——

داغؔ جو ۲۵ جولائی ۱۸۳۱ء کو دلی میں پیدا ہوئے، پیدائشی شاعر تھے

شاعرانہ خصوصیات اور فنی باریکیاں ان کی کنیزیں تھیں —— خود زبان کے بادشاہ تھے —— انھوں نے ذوق اور غالب ایسی برگزیدہ ہستیوں سے فیض اٹھایا اور اس طرح ذوق کی سلاست غالب کی لطافت اور قلعہ معلیٰ کی زبان کو یک جا کر کے، ان میں اپنی شوخی اور تیکھے پن کی تمام ادائیں اتار دیں۔

ان کا کلام اُردو زبان کے محاوروں اور روزمرہ بول چال کا خزینہ ہے۔ ان کے کلام کی مقبولیت کی وجہ زبان کی سلاست، بیان کا بانکپن اور طبیعت کی شوخی اور چنچلتا ہے —— عشق و عاشقی کے معاملات ان کا خاص مضمون ہے۔ اپنی غزلوں میں تصنع، بناوٹ لفظوں کی صناعی اور فارسی تراکیب سے حذر کیا ہے، خود بھی کہتے ہیں۔

کہتے ہیں اُسے زبان اُردو　　　جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

مشاہیر دلّی اور دوسرے بزرگ داغؔ کے معترف ہیں۔ آزردہ، داغؔ کے مداح تھے۔ حالیؔ نے اپنی طویل غزل میں جس کا مطلع یہ ہے۔

جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز —— دوستو! دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز

دِلّی کے نوحہ کے ساتھ ساتھ داغؔ کی اس طرح تعریف و تحسین کی ہے۔

داغؔ و مجروحؔ کو سُن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

اسی طرح ایک مشاعرہ میں مرزا داغؔ نے جب یہ مطلع پڑھا۔

بزم گلشن میں نہ کھلنا گل تر کی صورت　　　جاؤ بجلی کی طرح آؤ نظر کی صورت

تو مولانا (حالیؔ) نے اس شعر کو بار بار پڑھوایا —— اور کہا "حاصلِ مشاعرہ یہ مطلع ہے۔ داغ داغ ہے بلکہ روشن چراغ ہے"۔

علامہ اقبال نے بھی "داغ" میں آنسو بہائے ہیں۔

چل بسا داغؔ آہ! میت اس کی زیب دوش ہے
آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے (بانگ درا)

اور ضؔ کی ستائش کرتے ہیں۔

اب کہاں وہ بانکپن! وہ شوخیٔ طرزِ بیاں
آگ تھی کافورِ پیری میں جوانی کی نہاں

تھی زبانِ داغؔ پر جو آرزو ہر دل میں ہے
لیلیٰ معنی وہاں بے پردہ، یاں محمل میں ہے

پھر خود روتے ہوئے دلی کو اس کے "سپوت" کی یاد دلاتے ہیں اور اسے "سینہ شگافی" کی تلقین کرتے ہیں۔

اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں
تو بھی رو اے خاکِ دلی! داغؔ کو روتا ہوں میں

وہ گل رنگیں ترا رخصت مثالِ بو ہوا
آہ! خالی داغؔ سے کاشانۂ اردو ہوا،

دربار رامپور میں داغؔ تنہا دبستانِ دلی کے نمائندہ تھے۔ باقی سب خصوصاً اسیرؔ منیرؔ۔ امیرؔ مینائی اور جلالؔ لکھنؤ سکول کے استاد تھے اور داغؔ کے مدمقابل تھے۔ لیکن اس کے باوجود داغؔ تنہا سب پر چھائے رہے۔

داغؔ زود گو تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی مثنوی فریادِ داغؔ (۸۳۸ اشعار) دو ہی دنوں میں کہہ ڈالی۔ اس مثنوی میں حجاب (طوائف) سے اپنا والہانہ عشق اور پھر اس عشق کے ردِّ عمل کی باتیں بڑی ہی لطیف پیرائے میں بیان کی گئی ہیں اس مثنوی کا اختتام دیکھیے:۔

یاالٰہی نجات غم سے ملے
وہ سراپا حجاب ہم سے ملے

ورنہ اس کا خیال بھی نہ رہے
اب ہے جیسا یہ حال بھی نہ رہے

داغؔ، کلکتہ کی ایک ڈیرہ دار طوائف منی بائی کو جو حجاب تخلص کرتی تھی۔ اور حسن و موسیقی میں کامل تھی۔ جب رامپور پہنچی تو دل دے بیٹھے تھے۔ اور یہ مثنوی اسی

تڑپ اور اضطراب کا نتیجہ ہے۔

داغ نے غزل کے تقریباً چودہ ہزار اشعار کہے ہیں۔

تمکین کاظمی لکھتے ہیں۔

میں نے بڑی دقت سے داغ کے پانچوں دیوان اکٹھے کئے ہیں۔ ان کی غزلیں شمار کیں اور غزل کے شعر گنے تو یہ اعداد برآمد ہوئے۔

۱۔ گلزار داغ	۳۹۱	غزلیں	کل ۴۹۴۳	شعر
۲۔ آفتاب داغ	۱۲۹	غزلیں	کل ۱۷۵۶	شعر
۳۔ مہتاب داغ	۲۹۲	غزلیں	کل ۴۱۷۶	شعر
۴ یادگار داغ	۱۵۶	غزلیں	کل ۲۷۷۲	شعر
۵ ضمیمہ یادگار داغ	۷۰	غزلیں	کل ۱۱۳۶	شعر
جملہ	۱۰۳۸	غزلیں	کل ۱۴۷۸۳	شعر

قصائد اور قطعات وغیرہ متفرقات تقریباً پانچ ہزار فرض کئے جائیں تو کل سرمایہ شعری بیس ہزار ہو سکتا ہے ....

اگر داغ کا ایک دیوان ہنگامۂ غدر میں ضائع نہ ہوتا اور ایک حیدرآباد میں چوری نہ ہو جاتا۔ اور ایک آخری دیوان حضورؐ کے پاس داخل نہ ہو جاتا تو شاید آج ہمارے سامنے داغ کے تیس چالیس ہزار شعر کم از کم ضرور ہوتے۔

داغ کا اصل میدان ہی غزل گوئی تھا !

انہوں نے ۱۶ فروری ۱۹۰۵ء کو وفات پائی۔ اور حیدرآباد دکن میں درگاہ حضرت یوسف شریف نام پلی، میں اپنی بیوی کے پہلو میں دفن ہوئے۔

نمونہ کلام (داغ)

روپوش ہوا نقشہ ہی پیغام ہمارا   ڈھونڈے کوئی قاصد کو ابھی تک تو یہیں تھا

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا !
دیکھا ہے میکدے میں جو اے شیخ کچھ نہ پوچھ
ہم بوسہ لے کے ان سے عجب چال کر گئے
خدا کریم ہے یوں تو مگر ہے آتا رشک
وہ ناز سے زمین پر رکھتے نہ تھے قدم !
برائی میں بھی ہو گا کوئی مطلب
مجھے کوسیں بلا سے گالیاں دیں !
مجھے تم جانتے ہو داغ ہوں میں
میخانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
زاہد کی توبہ تو رہی گھونٹ گھونٹ پر
لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہاں ہاں تڑپ کے گزاری تمہی نے رات
تو بھی اے ناصح کسی پر جان دے
کبھی بیٹھے کبھی اٹھے کبھی لوٹے کبھی تڑپے
شب وصل ایسی کھلی چاندنی
جفا پہ وفا تو کروں سوچ لو !
غم ہجر میں داغ مجھ کو نجات
لاتے ہو اسی کو خاک میں جو دل سے ملتا ہے
طبیعت کوئی دن میں بھر جائے گی

جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا
ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا
یوں بخشوا لیا کہ یہ پہلا قصور تھا
کہ میرے عشق سے پہلے تجھے جمال دیا
تعریف کر کے اور بھی ہم نے اڑا دیا
وہ کرتے ذکر کیوں بیکار میرا
مگر وہ نام لیں ہر بار میرا
کہیں جاتا ہے خالی وار میرا
ہر شخص پوچھتا تھا کہ حضرت ادھر کہاں
سو بوتلیں اڑا کے بھی ہشیار ہی رہا
ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں
ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے
تم نے ہی انتظار کیا ہم نے کیا کیا !
ہاتھ لا استاد کیوں کیسی کہی
تماشہ دید کے قابل ہے تیرے بیقراروں کا
وہ گھبرا کے بولے سحر ہو گئی
تمہیں مجھ سے الفت اگر ہو گئی
یقیں تھا نہ ہو گی مگر ہو گئی
مری جان چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے
چڑھی ہے یہ آندھی اتر جائے گی

گل ہرے ہو گئے چمن میں داغ
تجھ پہ رونق مگر نہیں آتی

سن کے اللہ کی تعریف کہا اس بت نے
تو نے ہم میں تو کوئی عیب نکالا ہوتا

راہ میں ان کو وہم تھا کوئی نہ بدگماں ہو
گئے تو ساتھ ساتھ وہ مجھ سے مگر الگ الگ

اٹھ گئی یوں وفا زمانے سے
کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں
اگر نہ آگ لگا دوں تو داغ نام نہیں

الٰہی تو نے حسینوں کو کیوں پیدا کیا
کچھ ان کی ذات سے دنیا کا انتظام نہیں

کر دیا مجبور اس عاشق مزاجی نے مجھے
آ ہی جاتی ہے طبیعت میں کروں تو کیا کروں

دل سے وہ کافر صنم نکلے تو سب کچھ ہو قبول
جا کے مسجد میں عبادت میں کروں تو کیا کروں

بہکتے نہ تھے داغ یوں گفتگو میں
مگر پی گئے آج حضرت زیادہ

یہ فصل اگر ہو گی تو ہر روز پئیں گے
ہم مے سے کریں توبہ کہ برسات سے توبہ

وہ آئی گھٹا جھوم کے للچانے لگا دل
واعظ کو بلاؤ نہ چلی بات سے توبہ

دنیا میں کوئی بات ہی اچھی نہیں زاہد
اس بات سے توبہ کبھی اس بات سے توبہ

رہ عشق کی ٹھوکریں ہم سے پوچھو
کہ سنبھلے ہیں گر گر گرے ہیں سنبھل کر

نہ پوچھو شب ہجر کیوں کر بسر کی
یہ کروٹ بدل کر وہ کروٹ بدل کر

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

دیکھتے ہی مجھے محفل میں یہ ارشاد ہوا
کون بیٹھا ہے اسے لوگ اٹھاتے بھی نہیں

بھٹک کر راہ سے وہ یہاں آتے آتے
اجل مر رہی تو کہاں آتے آتے

مجھے یاد کرنے سے یہ مدعا تھا
نکل جائے دم ہچکیاں آتے آتے

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی
بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

ابھی سن ہی کیا ہے جو بے باکیاں ہوں
انہیں آئیں گی شوخیاں آتے آتے

چلے آتے ہیں دل میں ارمان لاکھوں
مکان بھر گیا میہماں آتے آتے

نتیجہ نہ نکلا تھکے سب پیامی
وہاں جاتے جاتے یہاں آتے آتے

سنانے کے قابل جو تھی بات ان کو
وہی رہ گئی درمیاں آتے آتے

تری آنکھ پھرتے ہی کیسا پھرا ہے
مری راہ پر آسماں آتے آتے

مرے آشیاں کے تو تھے چار تنکے
چمن اُڑ گیا آندھیاں آتے آتے

کسی نے کچھ ان کو ابھارا تو ہوتا
نہ آتے نہ آتے یہاں آتے آتے

نہیں کھیل اے داغؔ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے، اردو زباں آتے آتے

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تیری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

دیکھ کر قاتل کی آمد داغؔ دل میں شاد شاد
اور غم خواروں کے منہ پر مُردنی چھائی ہوئی

ظاہر تو اختلاط کی باتیں ہوا کریں
دل میں اگر نہیں ہے محبت نہیں سہی

اقرار کر کے گھورتے ہو کیوں میری طرف
باور سہی یقین ہی دل نشیں سہی

بیداد کر کے چاہتے ہو پھر جفا کی داد
بہتر، بجا، درست صحیح آفریں سہی

نفرت ہے حرفِ وصل سے اچھا یونہی سہی
لو آؤ اور بات سنو وہ نہیں سہی

مشقِ جفا کے واسطے کس کی تلاش ہے
کوئی اگر نہیں ہے تو یہ کم ترین سہی

آرام کچھ کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گا!
زیرِ فلک نہیں ہے تو زیرِ زمیں سہی

بے دل لگی بھی داغؔ گزرنی محال ہے!
دل وہ نہیں سہی وہ تمنا نہیں سہی!

کس طرح کہوں قیس ترے دل کو لگی ہے — نالوں سے کہیں آگ بھی محمل میں لگی ہے،
انصاف سے دشمن نے کبھی حق میں ہمارے — اچھی بھی کہی ہے تو بُری دل کو لگی ہے
میں تیرے سوا اور نہ اللہ سے مانگوں — قدرت سے بھی دھن ترے سائل کو لگی ہے

ساقیا دے بھی ہے، رُوح فزا تھوڑی سی
بے وفا عمر کرے اور وفا تھوڑی سی
داغ یہ مے ہے یہ ساغر ہے کہاں کی توبہ
بل خدا کے لئے اے مرد خدا تھوڑی سی

آئینے میں کیا دیکھتے ہو اپنی ادائیں
اس ناز اس انداز کو پوچھو مرے جی سے
ارشاد ہوا ہے کہ تجھے قتل کریں گے
پھر یہ بھی ہے تاکید کہ کہنا نہ کسی سے
معشوقوں کو عُشاق نے بے درد بنایا
انصاف تو یہ ہے کہ ہوئی چوک سبھی سے

اُسے بھی مجھ کو بھی ضد آ پڑی ہے ! — خرابی بیچ والوں کی بڑی ہے !
کریں کیا رند توبہ مے سے زاہد — کہ یہ تو ان کی گھٹی میں پڑی ہے
عدو بھی تنگ ہے ان کے ستم سے — اُسے اپنی مجھے اپنی پڑی ہے
ابھی میں نے کیا تھا یاد اس کو — وہ آیا عمر قاصد کی بڑی ہے
نگاہِ شوخ جب اس سے لڑی ہے — تو بجلی تھر تھرا کر گر پڑی ہے

قیامت میں قیامت کر گیا کون — کہ دل تھامے صفِ محشر کھڑی ہے
کیا ہے میں نے ضبطِ آہ جس دم — اَنی برچھی کی سینے میں گڑی ہے
یہ کہتا ہے مرا شوقِ شہادت — تری تلوار پھولوں کی چھڑی ہے

الٰہی کب سحر ہوگی شبِ ہجر کی
قیامت کی گھڑی ہے جو گھڑی ہے

نمونہ کلام (امیر مینائی)

پھنسا رہے ہیں خون مرا کر کے کیوں قصور — اب اس پہ خاک ڈالئے جو کچھ ہوا ہوا
شیخ کو تھوڑا نہ جانو یہ بڑا مکار ہے — ساری دنیا چھوڑ بیٹھا ہے نمازیں چھوڑ رہیں
چالاکیاں تو دیکھو مجھے قتل کر کے خود — اوروں سے پوچھتے ہیں یہ کیا ماجرا ہوا
کھو گیا دِل کھو گیا رہتا تو کیا ہوتا امیرؔ — جانے دو اک بیوفا جاتا رہا جاتا رہا
آئے جو میری لاش پہ وہ طنز سے بولے — اب ہم ہیں خفا تم سے کہ تم ہم سے خفا ہو
ہم چلے دَیر سے کعبہ کو تو وہ بت بولا — جا کے لے لیجئے کعبہ میں خدا رکھا ہے
انگور میں تھی یہ مے پانی کی چار بوندیں — جس دِن سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے
مجھ کو دیکھا تو غیر سے بولے — آپ بھی مجھ کو پیار کرتے ہیں
پہلے تو آرسی میں منہ اس نے اپنا دیکھا — پھر ہنس کے مجھ سے بولا کیا مانگتے ہو بولو۔
تم کو آتا ہے پیار پر غصہ — مجھ کو غصہ پہ پیار آتا ہے!
نہ چوک وقت کو پا کر کہ یہ وہ معشوق — کبھی امید نہیں جس سے جا کے آنے کی
گھٹا میں برق جو چمکی تو یاد آئی امیرؔ — ادا کسی کی وہ پردہ اٹھا کے آنے کی
بڑھ جاتی ہے چمن میں اور آرزو تمہاری — جس گل کو سونگھتا ہوں آتی ہے بو تمہاری
جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی — وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا
خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ — سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

کیا تنگ ہے جلّاد مری سختی جان سے
ہر وار پہ کہتا ہے کہ ظالم کہیں مر بھی

ڈراؤں حشر کی فریاد سے تو کہتے ہیں
ہمارے آگے تمہاری وہاں سنے گا کون

روز آنے کو جب کہا بولے
اک تمہیں مجھ کو پیار کرتے ہو

نمونہ کلام (جلال)

تڑپ دِل کی دکھاتا تھا جلال ان شوخ چشموں کو
وہیں کی سخت نے سُستی جہاں چالاک ہونا تھا

ہم اہل جلنے نہ پیر مغاں کی صحبت میں
بہت ابھار نے ڈھالے تھے اک شباب نہ تھا

جلال پاس سے اس کے ہٹی نہ روزِ وصال
حیا کی آنکھ میں اسدن ذرا حجاب نہ تھا

ہم کو افشاں دکھا دو ماتھے کی !!
پھر مزہ دیکھ جباں فشانی کا

آنسو رکے تو کیا نہیں چھپنے کا راز عشق
حسرت ٹپک پڑے گی ہماری نگاہ سے

نمونہ کلام (تسلیم)

ہائے جب کہتا ہوں اس سے سوز دل کہتے ہیں وہ
چُپ رہو راز محبّت داستاں ہو جائے گا

نہیں معلوم بگڑی آج کس سے
مزہ ہے دشمنی میں دوستی کا !

افسانہ گو نے اور بھی بے خواب کر دیا
ظالم سنا رہا ہے مری داستاں مجھے

پارسائی ان کی جب یاد آئے گی
مجھ سے میری آرزو شرمائے گی

یہ تو مانا دیکھ آئیں گے یار
پھر تمنّا اور کچھ فرمائے گی !

ہجر کی شب گر یہی ہے اضطراب
نیند اے تسلیم کیوں کر آئے گی

دیکھتے ہی دیکھتے وہ تسلیمؔ چھپنے لگے
بڑھ گیا بے پردگی میں مجھ سے پرداز بھی

غدر کے بعد غزل کے نئے دور کا آغاز ہوتا ہے اور پہلی دفعہ غزل اور نظم میں کش مکش شروع ہوتی ہے. لاہور کا تاریخی مناظرہ ایک نئے عہد کا نقیب ہے جس کے علمبردار حالیؔ اور آزاد ہیں. حالیؔ کی نشوونما غالب اور شیفتہ کے زیر سایہ ہوئی تھی۔ حالی غزل کے قدیم انداز سے بیزار ہیں اور جدید غزل کے امام ہیں۔

ان کی قیادت میں غزل جدید راستوں پر چل نکلتی ہے اور نئی منزل کی تلاش میں جادہ پیما ہو جاتی ہے —— گو غزل میں تبدیلیاں غالبؔ کے ہاتھوں ہی رونما ہو چکی تھیں۔ لیکن حالیؔ نے اس میں اور تیزی پیدا کی، اور وقت کے تقاضوں کے مطابق اصلاح غزل کی تحریک چلائی —— اور حسن و عشق کی باتیں چھوڑ کر غزل میں نئے نئے مضامین اور خیالات داخل کئے —— اور اس طرح غزل زندگی کے قریب تر ہو گئی اور حقیقت اور واقعیت نے اسے اپنا مسکن بنا لیا —— اب غزل میں وسعت پیدا ہو گئی حُسن و عشق کے معاملات و موضوعات کے علاوہ، اس میں قومی، ملکی، اخلاقی، اور سیاسی مضامین داخل ہونے لگے ——!

حالیؔ کا کمال اس میں مضمر ہے کہ انہوں نے قومی تہذیبی اور اخلاقی مضامین غزل میں شامل کئے لیکن پھر بھی غزل کے مخصوص انداز کو ٹھیس تک نہ پہنچی —— حالیؔ نے خود بھی اپنی غزلوں میں تتبع، تکلف، تصنع، غلو سے احتراز کیا ہے۔ سادگی، سلاست متانت، تہذیب، صفائی، جذبات اور درد انہیں مقدم ہے —— انہوں نے خیالات میں ہمواری اور توازن کو مدِ نظر رکھا اور عبارت کو تعقید اور تکلف سے پاک کیا —— حالیؔ "مقصدیت" کے قائل ہیں۔ اور غزل میں سماجی۔ اجتماعی زندگی سے متعلق مسائل و خیالات کا اظہار چاہتے ہیں —— ان کی شاعری انسان کی سوجھ بوجھ کو اکساتی ہے اور جذبات کو چونکاتی ہے —— حالی واعظانہ اور ناصحانہ انداز اختیار کرتے ہیں لیکن غزل کو بے کیف نہیں ہونے دیتے اور یہی ان کی خوبی ہے ——!

حالیؔ نے غزل کو نئی ذمہ داریاں بخشی ہیں۔ اور اس میں افادیت کے رنگ بھرے ہیں —— ان کی غزل میں اشارے ہیں۔ ایمائیت ہے اور اجمال ہے سادگی اور نغمگی کی خوش گوار آمیزش ہے —— وہ دل کی سچی سچی باتیں بے تکلف

اور بے ساختگی سے کہتے چلے جاتے ہیں ۔۔۔ حالی کی غزل میں انفرادیت کی مخصوص شان ہے اور اس انفرادیت میں جلال ہے ۔ ـــــ معنویت افادیت اور شعریت ، انہیں دل و جان سے عزیز ہیں ۔ سلاست اور سیدھا پن ان کے کلام کے رگ و پے میں جذب و سارہی ہے ـــــ واقعیت اور صداقت کے حالی قائل ہیں ۔ اور ان کی تلقین کرتے ہیں ـــــ قوم کے درد سے ان کا سینہ لبریز ہے ۔۔۔ وہ شاعری سے خوابیدہ قوم کو چونکا دینے کے خواہاں ہیں ۔

نمونہ کلام

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن
راگنی بیوقت کی اب گا ہیں کیا !

یاد ہے اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط مگر اسقدر کہاں

یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا !
ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا

داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز

ڈھونڈتا ہے دل شوریدہ بہانے مطرب
درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی ، مصور ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

لے کے داغ آئیگا سینہ پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انہیں بھول گئے
ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ ہرگز

بزم ماتم تو نہیں ، بزم سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

شیخ ماشاءاللہ رہے تیری حیا داری
کس تو جہ سے پڑھ رہا ہے نماز

ہم کو نسبت پہ فخر ہے تیری !
تو گئی بھول ہم کو خاک حجاز

رنگ بدلا ہوا ہے عالم کا ہیں دگرگوں زمانہ کے انداز
چھپتے پھرتے ہیں کبک و تیہو سے گھونسلوں میں عقاب اور شہباز

ہو گئے ہیں ہم ہی کچھ اور آج کل یا زمانہ ہی گیا یا رب بدل
رہ گئے ہیں کچھ کچھ آثارِ خلف اور بھی ہونا ہے شاید پھتذل
اب سنو حالی کے نوحے عمر بھر ہو چکا ہنگامۂ مدح و غزل

یاروں کو تجھ سے حالی کچھ سرگرانیاں ہیں نیندیں اچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں
یاد اس کی دل سے دھو دے اے چشم تر تو مانو اب دیکھنی مجھے بھی تیری روانیاں ہیں
بنتے ہیں غیر اپنے ہوتے ہیں رام وحشی الفت کی بھی جہاں میں کیا حکمرانیاں ہیں
ہوگا تو پہلے ہوگا اے چرخ مہرباں تو کچھ ان دنوں تو ہم پر نامہربانیاں ہیں
اپنی نظر میں بھی یاں اب تو حقیر ہیں ہم بے غیرتی کی یارو اب زندگانیاں ہیں!
روتے ہیں چار ہم پر ہنستے ہیں چار ہم پر یاں تک ہماری پہنچی اب ناتوانیاں ہیں
ہر حکم پر ہوں راضی ہر حال میں ہیں خوش حصہ میں اب ہمارے یہ شادمانیاں ہیں
خاور سے باختر تک جن کے نشان تھے برپا کچھ مقبروں میں باقی ان کی نشانیاں ہیں
دیکھا نہیں ابھی کچھ قحط الرجال تم نے اس سے بھی سخت آنی آگے گرانیاں ہیں
کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا کچھ کر لو نوجوانو! اٹھتی جوانیاں ہیں
فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں گر یہ نہیں تو بابا یہ سب کہانیاں ہیں
رونے میں تیرے حالی لذت ہے کچھ نرالی
یہ خوں فشانیاں ہیں یا گل فشانیاں ہیں

کم سے کم وعظ ہی آتا تو اثر ہو واعظ — بول قوال کے جو دِل میں اثر کرتے ہیں
کی نصیحت بُری طرح ناصح — اور اک بس ملا دیا رس میں
ہو نہ بینا تو فرق پھر کیا ہے — چشم انسان و چشم نرگس میں
ہو فرشتہ بھی تو نہیں انسان! — درد تھوڑا بہت نہ ہو جس میں
جانور، آدمی، فرشتہ، خدُا، — آدمی کی ہیں سینکڑوں قسمیں

منہ سے دھواں سا اٹھا لیتے ہی نام اسلام — بارود بجھ رہی تھی گویا لب و دہن میں
پھر زخم پھوٹ نکلا حالی نہ چھیڑنا تھا! — فصلِ خزاں کا قصہ ذکرِ گل و سمن میں
وہ قوم جو جہاں میں کل صدر انجمن تھی — تم نے سنا بھی؟ اس پر کیا گزری انجمن میں
پائین بزم بھی اب ملتی نہیں اسے جا — روندن میں ہے وہ گلبن پھولا تھا جو چمن میں
اس باغ کی خزاں نے کچھ خاک سی اڑا دی — فصلِ بہار گویا آئی نہ تھی چمن میں

قیس ہو، کوہکن ہو یا حالیؔ — عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں!
کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں — مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
یوں بے سبب زمانہ پھرتا نہیں کسی سے — اے آسماں کچھ اس میں تیرا بھی ہے اشارا!
بڑھاؤ نہ آپس میں ملّت زیادہ — مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ
کرو دوستو پہلے آپ اپنی عزت — جو چاہو کریں لوگ عزت زیادہ

کہدو ساقی سے کہ ہم مرتے ہیں پیاسے — گر مے نہیں دے زہر ہی کا جام بلا سے
در گزرے دوا سے تو بھروسہ ہے پہ دُعا کے — در گزریں دُعا سے بھی دُعا ہے یہ خدُا سے

بُری اور بھلی سب گزر جائے گی — یہ کشتی یونہی پار اتر جائے گی
رہیں گے نہ ملّاح یہ دن سدا — کوئی دن میں گنگا اتر جائے گی

حالی نے غزل کو جو نیا پن بخشا، اس زمانے کے بیشتر غزل گو شعرا اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ چنانچہ اکبر، چکبست اور اقبال ان ہی پیش پیش ہیں، اور پھر یہ سلسلہ، حسرت، جگر، فانی، یگانہ، فراق، فیض، احسان دانش، مجاز اور ناصر کاظمی وغیرہ تک پہنچتا ہے ——— اور غزل نئے بناؤ سنگاؤ کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے ———!

آج کی غزل میں، ہمیں وہ تمام رجحانات دکھائی دیتے ہیں جو دورِ رواں کی رُوح میں مستور ہیں، زندگی کا انگ انگ، اور حال کا ہر پہلو ——— غزل میں سمٹ آیا ہے ———!

آج کی غزل، آج ہی کا عکس ہے ———!

نمونہ کلام (اکبر)

یہ موجودہ طریقے راہیٔ ملکِ عدم ہوں گے — نئی تہذیب ہو گی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
بدل جائے گا انداز طبائع دورِ گردوں سے — نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسبابِ غم ہوں گے
بدل جائے گا معیارِ شرافت چشمِ دنیا میں — زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے

(اقبال)

الٰہی عقلِ خجستہ پے کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے — اسے ہے سودائے بخیہ کاری مجھے سرِ پیرہن نہیں ہے
یہاں کہاں ہم نفس میسّر، یہ دیس ناآشنا ہے اے دل — وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے کہ زیرِ چرخِ کہن نہیں ہے
نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا — بنا ہمارے حصارِ ملّت کی اتحادِ وطن نہیں ہے
نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے — ہوا نہ سرسبز رہ کے پانی میں عکسِ سروِ کنارِ جو کا
نئی تہذیب تکلف کے سوا کچھ بھی نہیں — چہرہ روشن ہو تو کیا حاجتِ گلگونہ فروش

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

مگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

سر یہ خاموشی کہاں تک؟ لذت فریاد پیدا کر!
زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

(حسرت)

اے شوق کی بیباکی وہ کیا تری خواہش تھی
جس پر انہیں غصہ ہے انکار بھی حیرت بھی

خود عشق کی گستاخی سب تجھ کو سکھائے گی
اے حسن حیا پرور شوخی بھی شرارت بھی

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہار حسن
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

مر مٹے ہم تو مٹ گئے سب رنج
یہ بھی اچھا ہوا برا نہ ہوا!

تم جفاکار تھے کرم نہ کیا
میں وفادار تھا خفا نہ ہوا

کہیں وہ آ کے مٹا دیں نہ انتظار کا لطف
کہیں قبول نہ ہو جائے التجا میری

مل گیا حسرت شہید وفا کا خوں بہا
ہو گئی یاں روتے روتے ہر دو چشم یار سرخ

اور تو پاس مرے ہجر میں کیا رکھا ہے
اک ترے درد کو پہلو میں چھپا رکھا ہے

کیا تامل ہے مرے قتل میں اے بازوئے یار
ایک ہی وار میں سر تن سے جدا رکھا ہے

(فانی)

بہار لائی ہے پیغام انقلاب بہار
سمجھ رہا ہوں میں کلیوں کے مسکرانے کو

گل خزاں کے راز کا محرم نظر آیا مجھے
ہر تبسم پردہ دار غم نظر آیا مجھے

(یگانہ)

گرفتاران ساحل کود پڑتے ڈر نکل جاتا
کبھی تو زیست مشکل آزماتی مرگ آساں کر

ناخدا کو نہیں اب تک تہ دریا کی خبر
ڈوب کر دیکھیے تو بیگانہ ساحل ہو جائے

اسی فریب نے مارا کہ کل ہے کتنی دور
اس آج کل میں عبث دن گزارے کیا کیا

(فراقؔ)

دیکھ رفتارِ انقلاب فراقؔ!
کتنی آہستہ اور کتنی تیز

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو

(فیضؔ)

یوں بہار آئی ہے امسال کہ گلشن میں صبا
پوچھتی ہے گزر اس بار کروں یا نہ کروں

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے ابھرنے لگتے ہیں

کیسے دئیے جلائے غمِ روزگار نے
کچھ اور جگمگائے غمِ یار کے محل

کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے

(احسان دانشؔ)

میں ویرانہ بھلا مجھکو مرے صحرا میں پہنچا دو
کہ میں پابندِ آدابِ گلستاں ہو نہیں سکتا

اب تو کعبہ میں روشنی کر دو
اب تو شہرِ بتاں سے لوٹ آئے

(مجازؔ)

نگاہِ لطف مت اُٹھ خوگرِ آلام رہنے دے
ہمیں ناکام رہنا ہے ہمیں ناکام رہنے دے

یہ میری دنیا، یہ میری ہستی
نغمہ طرازی، صہبا پرستی

شاعر کی دنیا، شاعر کی ہستی
یا نالۂ غم، یا شورِ مستی

سب سے گریزاں، سب پر برستی
آنکھوں کی مستی، مہنگی نہ سستی

یا خلد و ساقی اے جذبِ مستی
یا ٹکڑے ٹکڑے دامانِ ہستی

محوِ سفر ہوں، گرمِ سفر ہوں
میری نظر میں رفعت نہ پستی

ان انکھڑیوں کا عالم نہ پوچھو!
صہبا ہی صہبا، مستی ہی مستی

وہ آ بھی جاتے؛ وہ ہو بھی جاتے
چشمِ تمنا پھر بھی ترستی

اُن کا کرم ہے اُن کی محبت — کیا میرے نغمے کیا میری ہستی

تسکینِ دلِ محزوں نہ ہوئی وہ سعیِ کرم فرما بھی گئے — اس سعیِ کرم کو کیا کہیے، بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے
ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے، کچھ کہہ نہ سکے کچھ سن نہ سکے — یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے
آشفتگیِ وحشت کی قسم، حیرت کی قسم، حسرت کی قسم — اب آپ کہیں کچھ یا نہ کہیں، ہم رازِ تبسم پا بھی گئے
رودادِ غمِ اُلفت ان سے ہم کیا کہتے کیوں کر کہتے — اک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسو آ بھی گئے
اربابِ جُنوں پر فُرقت میں اب کیا کہیے کیا کیا گزری — آئے تھے سوادِ اُلفت میں کچھ کھو بھی گئے کچھ پا بھی گئے
یہ رنگِ بہارِ عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی! — محفل تو تری سُونی نہ ہوئی کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے
اس محفلِ کیف و مستی میں، اُس انجمنِ عرفانی میں — سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

جوانی اور یوں گھر جائے طوفانِ حوادث میں : — خُدا رکھے ابھی تو بیخودی کا دور ہے ساقی!
چھلکتی ہے جو تیرے جام سے اُس مے کا کیا کہنا — ترے شاداب ہونٹوں کی مگر کچھ اور ہے ساقی
مجھے پینے دے، پینے دے کہ تیرے جامِ لعلیں میں — ابھی کچھ اور ہے، کچھ اور ہے، کچھ اور ہے ساقی

کیا تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے گردشِ دوراں بھول گئے — وہ زلفِ پریشاں بھول گئے، وہ دیدۂ گریاں بھول گئے
اے شوقِ نظارہ کیا کہیے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں — اے ذوقِ تصور کیا کیجیے، ہم صورتِ جاناں بھول گئے
اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں، اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں — اے فصلِ بہاراں رخصت ہو، ہم لطفِ بہاراں بھول گئے
سب کا تو مداوا کر ڈالا، اپنا ہی مداوا کر نہ سکے — سب کے تو گریباں سی ڈالے، اپنا ہی گریباں بھول گئے
یہ اپنی وفا کا عالم ہے، اب ان کی جفا کو کیا کہیے — اک نشترِ زہر آگیں رکھ کر نزدیکِ رگِ جاں بھول گئے

رو دیں نہ ابھی اہلِ نظر حال پہ میرے — ہونا ہے ابھی مجھ کو خراب اور زیادہ

دل دھڑک اُٹھتا ہے خود اپنی ہی ہر آہٹ پر
اب قدم منزلِ جاناں سے بہت دُور نہیں

ہائے وہ وقت کہ جب بے پئے مدہوشی تھی
ہائے یہ وقت کہ اب پی کے بھی مخمور نہیں

حسن ہی حسن ہے جس سمت اٹھاتا ہوں نظر
اب یہاں طور نہیں، برق سرِ طور نہیں

دیکھ سکتا ہوں جو آنکھوں سے وہ کافی ہے مجاز
اہلِ عرفاں کی نوازش مجھے منظور نہیں

کیا کیا ہوا ہے ہم سے جنوں میں نہ پوچھئے
الجھے کبھی زمیں سے کبھی آسماں سے ہم

ٹھکرا دیے ہیں عقل و خرد کے صنم کدے
گھبرا چکے تھے کشمکشِ امتحاں سے، ہم

بخشی ہیں ہم کو عشق نے وہ جرأتیں مجاز
ڈرتے نہیں سیاستِ اہلِ جہاں سے، ہم

مہرباں اور اس درجہ کب تھا آسماں اپنا
الجھنوں سے گھبرائے میکدے میں در آئے

جلوۂ طور خوابِ موسیٰ ہے
کس نے دیکھا ہے کس کو دیکھا ہے

کون اُٹھ کر چلا مقابل سے
جس طرف دیکھئے اندھیرا ہے

جنونِ شوق اب بھی کم نہیں ہے
مگر وہ آج بھی برہم نہیں ہے

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

بہت کچھ اور بھی ہے اس جہاں میں
یہ دنیا محض غم ہی غم نہیں ہے

تقاضے کیوں کروں پیہم نہ ساقی
کسے یاں فکرِ بیش و کم نہیں ہے

اُدھر مشکوک ہے میری صداقت!
ادھر بھی بدگمانی کم نہیں ہے!

مری بربادیوں کا ہم نشینو!!
تمہیں کیا خود مجھے بھی غم نہیں ہے

ابھی بزمِ طرب سے کیا اٹھوں میں
ابھی تو آنکھ بھی پُر نم نہیں ہے،

بہ ایں سیلِ غم و سیلِ حوادث — مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے
مجازؔ اک بادہ کش تو ہے یقیناً — جو ہم سنتے تھے، وہ عالم نہیں ہے

یہ جہاں بارگہِ رطلِ گراں ہے ساقی — اک جہنم مرے سینے میں تپاں ہے ساقی
ہر چمن دامنِ گل رنگ ہے خونِ دل سے — ہر طرف شیون و فریاد و فغاں ہے ساقی
ماہ و انجم مرے اشکوں سے گہرتاب ہوئے — کہکشاں نور کی اک جوئے رواں ہے ساقی
میرے ہر لفظ میں بیتاب مرا سوزِ دروں — میری ہر سانس محبت کا دھواں ہے ساقی

کیا خبر خاک ہی سے کوئی کرن پھوٹ پڑے — ذوقِ آوارگیِ دشت و بیاباں ہی سہی
پہنچے گر کنارے ہم — بس غمِ دوراں ہارے ہم

غزل اور غالب

غزل کی وہ دوشیزہ جو جنوبی ہند سے لالہ کی سرخی، چاندنی کا نکھار اور نیلگوں پانیوں کی تمکنت لے کر جوہی کی ڈال کی مانند لچکتی ہوئی، شمالی ہند آئی تھی اب ایک حور بن گئی — حور بھی ایسی جسے کسی غلطی کی پاداش میں آسمانوں سے نکال دیا گیا ہے اور جو بڑی حسین، بڑی سندر اور بڑی ہی سروپ ہے — اور اپنی نرم نشیلی سانسوں سے اس کائنات کو مہکا رہی ہے۔

شعر تخیل کی زبان ہے (شیلے)
شعر شدید جذبات کا از خود چھلکنا ہے (ورڈزورتھ)
شعر مترنم خیال ہے (کارلائل)

اُردُو شاعری میں غزل کی اہمیت سے کسی کو بھی انکار نہیں۔ اس کی حیثیت اصناف سخن میں ایک حسین اور خوش رو ملکہ کی سی ہے۔ جس طرح ایک جمیل اور دل کش پیکر مختلف اعضا کے من بھاتے اور پُر جمال تناسب کا نام ہے۔ بعینہٖ غزل غنائیت شدت جذبات، نزاکت ادا، سوز و گداز کا ایک حسین مجسمہ ہے۔ فکر، شعور اور خلوص سے غزل میں روپ بھرا جاتا ہے اور غزل اپنی دلکشیوں، جاذبیتوں اور رعنائیوں کے ساتھ جواں ہوتی ہے ——!

غزل میں حسن و عشق کی آویزش سے فن کا ظہور ہوتا ہے اور سنبھالے سے لے کر نئے روپ میں ڈھلتا ہے —— غزل کی رگوں میں شاعر کا اپنا لہو ہوتا ہے جسے فنکار کا جذبۂ دل، خلوص اور انہماک گرماتا ہے —— امیر مینائی نے بھی تو کہا ہے ——

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعِ تر کی صورت

قلبی واردات اور باطنی کیفیات غزل کی بنیاد ہیں اور حسن و عشق کے معاملات — اور چوچلے اس کی روایت —— جیسا کہ غالب نے کہا ہے۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام — چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

غزل نے نہ صرف جمالیاتی تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ بلکہ یہ کئی صدیوں اور یگوں سے ہماری فکری، ذہنی، باطنی اور تہذیبی عکاسی کی امین بھی رہی ہے —— ہر نغمہ سنج، فن کے قلب و شعور میں جھانکا ہے اور ہر غزل گو نے اپنی استعداد اور قابلیت کے مطابق خونِ جگر کے گھونٹ پلا کر غزل کو پروان چڑھایا ہے مشتاق اور ولی دکنی سے لے کر، میر، سودا، درد، مومن، غالب اور داغ ایسی بیشتر ہستیوں نے اس کے ناز اٹھائے ہیں اور گام گام پر اس کی بلائیں لی ہیں۔

ولی نے اسے سادگی اور نمکینیت عطا کی ہے —— میر نے نرمی، گھلاوٹ اور ایک تھرتھری سی بخشی ہے —— درد نے طہارت اور تقدس کا قشقہ اس کی روشن پیشانی پر کھینچا ہے۔ مومن نے تیکھے پن سے اسے نوازا ہے —— غالب نے نغمگی موسیقی، تجمل، تفکر اور تعمق کے پھول اس پر برسائے ہیں۔ داغ نے چنچلتا اور شوخی سے بسایا ہے —— اور حالی نے صداقت، سچائی اور تہذیب سے اسے روشناس کیا ہے —— ان سب بزرگوں نے اپنی اپنی منفرد افتادِ طبع اور ذوق شوق کے مطابق اس کی سج دھج اور روپ سروپ میں اضافے کئے ہیں۔

غزل کی خوبصورت اور دلپذیر راج دھانی کے باہوش حکمران غالب ہیں۔ جنہیں تخیل کی نزاکت، تصور کی طہارت، فکر کی رفعت، فصاحت و بلاغت کی

حسن کاری، عذوبت و حلاوت کی سحر تراشی اور پر معنی حکمت آفرینی اور پر فلسفہ سخن سنجی کی وجہ سے دوام حاصل ہے۔

غالب نے اپنے مفکرانہ انداز اور پر خلوص جذبے کی شدت سے اردو غزل میں ایک بھرم اور ایک وقار پیدا کیا ہے۔ تفکر کو غزل کے سانچے میں ڈھالا ہے اسے جلا بخشی ہے۔ ان کی فکر مترنم ہے ——— اور ان کا ہر خیال، سوچ بچار، سوجھ بوجھ اور رؤیت کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ انہوں نے اپنی غزل میں سادگی اور بوقلمونی سے سحر لٹائے ہیں۔ ——— اور غزل کیساتھ اپنی عظمتوں کو بالا کیا ہے۔

اردو شاعری ہی نہیں۔ فارسی زبان پر بھی ان کے ان گنت احسان ہیں۔ خود ہی تو کہتے ہیں۔

فارسی بیں تا ببینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است

قابلیت، استعداد، فنی شعور اور اس کی پرکھ خدا داد ہے ——— کاوشوں اور تڑپ سے ان تک رسائی ممکن نہیں ——— اور پھر غالب کی تو تخلیق ہی اسی لئے ہوئی تھی کہ وہ اس مرحلے پہنچ سے فرسودگی اور کہنگی کی دھند کو چھانٹ دیں اپنی جدت پسندی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

رفتم کہ کہنگی ز تماشا برافگنم
در بزم رنگ و بو نمطی دیگر افگنم

غالب کی عظمت اور برتری کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ خود بین اور خود پسند شاعر اپنی سخنوری کی اٹھان اور شاعری کی رفعتوں سے خود بھی آگاہ ہے۔

گر شعر و سخن بدہر آئیں بودے ‌ ‌ ‌ دیوانِ مرا شہرت پرویں بودے
غالب اگر فن سخن دیں بودے ‌ ‌ ‌ آں دین را ایزدی کتاب ایں بودے

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم　　تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے!
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

غالبؔ مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پاؤں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں!
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

یہ مسائلِ تصوف! یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے!
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

غالب بہت ہی بڑے شاعر ہیں۔ ان کا ہر بول اپنے اندر پوری "غزلیت" رکھتا ہے — ان کے شعر کے انگ انگ میں ان کا گرم لہو موجزن ہے اور لہو بھی ایسا جس میں آنسوؤں کی نمکینیت اور تبسم کی رو پہلی جوت گھلی ہے۔ اور اس پر لطف یہ ہے کہ اس میں بانئے آشنگوں کے سرور کا دھیما سا رچاؤ بھی ہے۔ اور ان سب نے مل کر ان کے رنگ تغزل کو اور زیادہ گمبھیر اور گہرا کر دیا ہے!

غالب کے شعر بہتے ہوئے شفاف جھرنے ہیں، ساون بھادوں کی امنڈتی جھومتی گھٹائیں ہیں، ان کے مصرعے جیسے دوشیزہ کی مدور اور لوچ دار باہیں — جیسے انانیت اور مدھرتا کے بھرپور ساتے —۔ جیسے بادۂ ناب کی اٹھتی ہوئی موج — جیسے چاند کے تراشے ہوئے ٹکڑے —!

غالب نے حسن سے تیور اور عشق سے جنون، لے کر، ان کی اپنے لہو سے حنا بندی کی اور پھر غزل، سنبھل کر، تبسم کناں ہمارے سامنے آگئی۔

مرزا کے یہاں موضوع اور بیان کے نرالے نمونے ہیں۔ انہوں نے غزل کو صرف نکھارا ہی نہیں بلکہ اس میں گوناگوں اضافے بھی کئے ہیں —— اور پرانے مضمون نئے سرے سے سجائے ہیں وہ حسن و روپ کے شیدا ہیں، جہاں کہیں انہیں حسن دکھائی دیا ڈھیر سے سے اٹھا کر شعر کے کلیجے میں چھپا لیا —— فن کے لحاظ سے مرزا غالب کی غزل مکمل ترین غزل ہے۔

غالب کے اشعار کی سب سے بڑی خوبی تو یہی ہے کہ فوراً دل میں اتر جاتے ہیں۔ بادۂ کہنہ کی طرح ان کا نشہ تیز تر ہوتا جاتا ہے —— ان کی آب و تاب اور نکھرا ہوا جمال دھیما ہی نہیں پڑتا۔

دیکھئے کس قدر رسیلے الفاظ، کتنی نکھری ہوئی فکر اور کتنی اچھوتی اڑان ہے —— کیا ایسے اشعار جی سے اتر سکتے ہیں؟

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ — ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی — گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ — سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا
عرض کیجیے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں — کچھ خیال آیا تھا وحشت کا، کہ صحرا جل گیا
شوقِ ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا — قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی، یارب — تیر بھی سینۂ بسمل سے پر افشاں نکلا
بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا — اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پر جیتے ہم، تو یہ جان جھوٹ جانا — کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا — کبھی تو نہ توڑ سکتا، اگر استوار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے، ترے تیرِ نیم کش کو — یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا؟
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح — کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا!
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے — غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا!
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا؟ — نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا، — پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا؟
بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں، کہ ہم — الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اڑیں گے پرزے — دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں ترے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا،

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے، شراب تو دے

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ، مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائیگا

تنگیٔ دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا؟

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا؟
نہ ہوتا گر جدا تن سے، تو زانو پر دھرا ہوتا

سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا!
یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

جان تجھ پر نثار کرتا ہوں!
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے!

یا رب! وہ نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک!
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

غالبؔ ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں، بندگیٔ بوتراب میں

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہگذر کو میں

وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

ان پریزادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا — لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں — روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں؟

غنچہ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا، کہ یوں — بوسے کو پوچھتا ہوں میں، منہ سے مجھے بتا کہ یوں

مجھ سے کہا جو یار نے "جاتے ہیں ہوش کس طرح" — دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

وفاداری بشرطِ اُستواری اصل ایماں ہے — مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

اُبھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کے ایک تار — مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو!

وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا — تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لئے ہم مصوّری — تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے،

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو؟ — اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یا رب — قسم کھائی ہے اُس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی! — دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں؟ — اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل — میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ! — شرم تم کو مگر نہیں آتی!

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق — نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق — وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی — نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے، نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

چند تصویرِ بتاں، چند حسینوں کے خطوط — بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا — اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ سے اٹھا ظالم — کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ　　مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے؟

غالبؔ نے غزل کے ایک ایک شعر کو ایک ماہر اور صاحب ذوق فنکار کی طرح پرکھا ہے جانچا ہے اور اس کی روح میں غوطے لگا لگا کر اسے کھنگالا ہے اور پھر کہیں جا کر یہ انمول نادر اور اچھوتے نمونے سامنے آئے ہیں۔

غالبؔ نے غزل کی روایت کا بیحد احترام کیا ہے۔ انہوں نے اسے نہ صرف برقرار رکھا بلکہ ان کے ہاتھوں غزل کی یہ جانی پہچانی روایت بعض نئی باتوں سے بھی دوچار ہوئی ہے۔ انہوں نے عشقیہ شاعری کو سازِ زندگی سے ہم آہنگ کیا ہے۔ وہ زندگی کے شاعر ہیں۔ اور اس لئے مایوسیوں کے حصار میں بھی مایوس نہیں ہوتے۔

ان کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے یاس اور مزاح کو ایک سنگم پر کھڑا کر دیا ہے۔ ان کے بیانات یاس و مزاح کے حسین امتزاج پر مشتمل ہیں —— میرؔ ایسے عظیم اور بزرگ شاعر رنج والم اور حزن و ملال کے ابدی سایوں میں دبے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن غالبؔ یاس کی کرب نوا موج کے سینے میں اٹھتے ہی تبسم بکھیر دیتے ہیں۔ غم کے جھمیلوں میں اس کی مسکان جیسے زیست کے سناٹوں میں غموں کو للکارتا ہوا کوئی دیر آ رہا ہے —— جیسے سیاہ سل چیر کر کوئی نقرئی دھارا پھوٹ بہی ہے —— غالبؔ تو ہر چیز سے خوشیاں نچوڑ لینے کے عادی ہیں، پھر بھلا درد و کرب کو وہ کیسے معاف کر دیتے —— ان کے دل کے محل میں بیٹھ کر تو غزل کی لیلےٰ نے دل چرانے کے نئے نئے انداز سیکھ لئے ہیں۔

حزن و ملال اور لطف و مزاح کی یہی گنگا جمنی کیفیت تو ہے جس نے مرزا کے شعروں میں ایک عجیب سی جان اور ایک عجیب سا سرور پیدا کر کے رکھ دیا ہے!

بار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ　　گر نہیں وصل تو حسرت ہی نہیں

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں — گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

اک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق — نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا — نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا — رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے — لے آئیں گے بازار سے جاکر دل و جاں اور

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب — سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام — قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں — رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

غرضیکہ ان کے یہاں قنوطیت نہیں، ذہانت اور شوخی ہے —— دل میں درد اٹھتا ہے تو پوچھتے ہیں۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟ — آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

پھر خودداری آڑے آتی ہے اور سنبھال لیتے ہیں

دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا! — میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا

اور پھر تیرگیوں میں "رجائیت" کی ضو نمودار ہوتی ہے۔ اور وہ خوشیوں کے مارے بے تاب ہو جاتے ہیں۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی، دردِ لا دوا پایا!

گویا اس طرح مایوسیوں، ناکامیوں اور نامرادیوں سے، طمانیت، سکون اور سپھلتا کی دھوپ چھاؤں کھینچ کر من کا خرابہ سجا لیتے ہیں۔

غالب کی چنچل وش اور شوخ طبیعت افسردگیوں کے سامنے سپر بن جاتی ہے اور انہیں بہت کم پژمردہ ہونے دیتی ہے۔ وہ اوّل تو یاسیت کو قریب ہی نہیں آنے دیتے۔ غمگین ہی نہیں ہوتے اور اگر ہوتے بھی ہیں تو بامرِ مجبوری۔

مرزا کا دور، سیاسی انتشار اور افراتفری کا زمانہ تھا۔ ہند کے نیلگوں اور صاف آسمان کو مغرب کی "پیلی آندھیاں" اپنی بانہوں میں لپیٹنے کے لئے مضطرب تھیں ـــــ مُغلیہ سلطنت رو بہ زوال تھی۔ اور اس کا آفتاب مغربی فشار سے مغرب کی آغوش میں دم توڑ رہا تھا ـــــ انگریزوں کا عفریت چنگھاڑ رہا تھا۔ غم کے اندھیرے اُٹھ رہے تھے اور مشرق کی زندگی کے مختلف شعبوں پر غم واندوہ کی گھنگھور گھٹائیں۔ گہری ہو کر جھکتی چلی جا رہی تھیں ـــــ غالب دیکھ رہے تھے۔ ان کا دباؤ محسوس کر رہے تھے ـــــ ان کی رُوح ان میں دبتی جا رہی تھی۔ لیکن وہ پھر بھی اپنی افتادِ طبع اور فطری میلان کے مطابق ان اندھیروں سے اجالے چھین لینے کی کوشش کر رہے تھے اپنی مساعیِ جمیلہ سے اکتسابِ لذت کے کوشاں تھے ـــــ لطف کے جویا تھے ـــــ !

غالب نے جو کہ رئیس زادہ تھے اور جنھوں نے سونے کے پالنے میں آنکھیں کھولی تھیں۔ سونے چاندی کی شہنائیوں کے نغمے سنے تھے۔ ان جھومتی، اُمڈتی، برستی تاریکیوں کو دیکھا، بھیگے بھی، لیکن گھبرائے نہیں ـــــ ان اندھیروں کی دھاروں کو تھام کر انہیں مشعلِ راہ بنا لیا ـــــ !

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق	میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں
ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں	جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر
غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس	برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم
سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے	کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب	سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

غالب اپنے ذوق کی بوقلمونی اور شوق کی سج دھج سے، مترنم اور گداز لہجے سے کھنکتی بحروں اور شگفتہ ردیفوں اور قافیوں کے جھنکار سے۔ ولولے اور گھمبیرتا کی رنگا

زندگی سے رومان اور حقیقت کو یکجا کرتے ہیں —— اور اسی میں انہیں اولیت کا شرف حاصل ہے!

غالب کے یہاں زندگی اور ماحول پر چھا جانے کی کیفیتیں ہیں وہ غم جاناں کے روایتی غم کو تیاگ کر غم دوراں کے شدید احساس اور زندگی کی ٹھوس، سنگین اور بھاری بھرکم حقیقتوں کے شعور کو اپنے سینے میں جگہ دیتے ہیں۔

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں — تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے — غم عشق گر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا
قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ — ہتھکنڈے ہیں چرخ نیلی فام کے
گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار — لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
مارا زمانے نے اسداللہ خاں تمہیں، — وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

غالب کے بعد غم دوراں کا احساس گہرا ہوتا گیا۔

غالب غموں کو ہنس ہنس کر سہتے ہیں اور ساتھ ہی ان سے نبرد آزما ہونے کی تلقین بھی کرتے ہیں —— ان کے سامنے نہ وہ خود جھکتے ہیں اور نہ ہی اوروں کا ان کے حضور جھکنا پسند کرتے ہیں۔ وہ اذہان اور دلوں سے مایوسیوں کے رنگ اور یاس کی سیاہیاں کھرچ کر ان میں احساس اور شعور بھرنا چاہتے ہیں۔ زندگی اور دنیا سے لڑنا سکھاتے ہیں۔

وہ مصائب کو خاطر میں نہیں لاتے۔ درماں کا احسان نہیں اٹھاتے۔ ان کے نزدیک تو درد وفا ہی تمام راحتوں کا سرچشمہ ہے۔ دکھوں سے ہی سکون اور آرام پھوٹتے ہیں اور جب یہ دکھ حد سے تجاوز کر جاتے ہیں تو خود ہی دوا

مٹ جاتے ہیں۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج | مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

دردمنت کش دوا نہ ہُوا | میں نہ اچھا ہُوا بُرا نہ ہُوا،

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا | درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

پانے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے | رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

غالب اسی پہ اکتفا نہیں کرتے بلکہ اور آگے بڑھ کر مزے لوٹنے کی خاطر دل کو "دونیم" کر ڈالتے ہیں۔ دل کو دھکتا ہوا آتشکدہ بنا لیتے ہیں۔

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دونیم
دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہ ہو
ہے ننگ سینہ، دل اگر آتشکدہ نہ ہو
ہے عارِ دل، نفس اگر آذرفشاں نہ ہو

محبت، غم بن گئی تو انسان امر ہو گیا۔ غم نے اثبات اپنایا اور خلوص محبت کو دوام حاصل ہو گیا —— غم میں اگر ثبات نہ ہو، تو محبت کے خلوص کو گھن لگ جاتا ہے اور محبت ہوس بن جاتی ہے —— محبت کی آگ اور شعلے، قدر شناسِ غم کو اپنی طرح اُجلا اور روشن بنا دیتے ہیں۔ دِل کُندن ہو جاتا ہے —— آلام و مصائب کی کثرت خوان نعمت ہے۔ اور دِل کے زخم اور خون فشانی خلوص محبت کی کسوٹی ہے۔ غم میں جب شدت در آتی ہے تو غم لذت بن جاتا ہے —— غالب خونفشانی کی تلقین کرتے ہیں۔

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یارب! اسے قسمت میں عدو کی
رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل

جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے
تب نازگرانِ پاگیِ اشک بجا ہے
جب لختِ جگر، دیدۂ خونبار میں آوے
کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

غالب کی اُردو غزل میں مزاج کے انتہائی حسین، بیحد نفیس اور پر لُطف نمونے ملتے ہیں۔ جو انہیں امتیازی شان بخشتے ہیں۔ ان کے کلام میں یہ مزاج اپنے بھرپور شباب میں ہے ـــــ مرزا سے پیشتر اُردو شاعری میں مزاج کے ایسے لطیف اور با مذاق نمونے نہیں ملتے ـــــ تھوڑا بہت جو مزاج ہے وہ پھکڑ پن یا ریختی سے پیدا ہونے والی بے ہودگی اور مسخرے پن پر مبنی ہے ـــــ یا پھر زاہد و محتسب اور ناصح و شیخ سے چھیڑ چھاڑ ہے ـــــ غالب نے اپنی شگفتہ مزاجی سے مزاج میں ایسی لطافتیں بھریں کہ مزاج، ان مٹ قدروں کا حامل بن گیا اور اس میں ایک پاکیزہ سی رُوح، انتہائی سلیقے اور خوش فنی سے سمٹ کر بیٹھ گئی ـــــ بعض جگہ غالب نے یہ انداز اور ڈھنگ، حقائق سے متعارف اور روشناس کرانے کے لئے بھی اختیار کیا ہے!

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب — آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی
لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا — گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی
بعد یک عمر ورع بار تو دیتا بارے — کاش رضواں ہی در یار کا درباں ہوتا

غالب اگرچہ صوفی نہیں تھے اور نہ ہی تصوف ان کا میدان رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اکثر جگہ ان کے اشعار سے صوفیانہ رنگ مترشح ہے۔ ان کی غزلوں کے انگ کہیں کہیں تصوف میں ڈوبے ہوئے ہیں —— غالب نے زندگی کی ہی باتیں نہیں کی ہیں۔ وہ صوفی بن کر بھی سوچتے ہیں۔ دنیا سے ہٹ کر کسی اور طرف بھی لو لگاتے ہیں —— مسائل تصوف کی طرف انہوں نے خود بھی اشارہ کیا ہے۔

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا!
جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید — مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو
جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

کائنات میں بیشمار چیزیں ہیں۔ انسان انہیں ہر گھڑی، اٹھتے بیٹھتے، سوتے، جاگتے چلتے، پھرتے دیکھتا رہتا ہے —— یہ تمام چیزیں اس کی نگاہوں میں رہتی ہیں لیکن "دیدۂ بینا" ان مختلف اور کثیر التعداد چیزوں میں "وحدت" کو دیکھتی ہے۔ شاہد حقیقی اگرچہ غیر حقیقی موجودات کے جھرمٹ میں چھپا ہوا ہے۔ لیکن پھر بھی عاشق صادق کی مضمحل اور بیقرار نگاہیں اسے پہچان ہی لیتی ہیں —— وہ اسے تنہا دیکھتی ہیں، اور اس کا مشاہدہ کرتی ہیں۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے

حیران ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

غالب شاعر ہی نہیں ایک مشفق ناصح بھی ہیں۔ دھیرج اور اطمینان سے ہمیں نصیحت کرتے ہیں اور نصیحت بھی اس انداز میں کہ جس میں کوئی اکھڑ پن کوئی بد مذاقی اور درشتی نہیں ہے۔

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا　　اور درویش کی صدا کیا ہے؟
نہ سنو گر برا کہے کوئی　　نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی　　بخش دو گر خطا کرے کوئی

وہ ایک فلسفی بھی ہیں اور ان کا طرزِ فکر فلسفیانہ ہے اور اسی لئے ہمیں ان کی غزل میں فلسفیانہ رنگ بھی دکھائی دیتے ہیں —— ان کی فکر اور تخیل میں فلسفہ کا رچاؤ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ فلسفہ ان کے فن پر حاوی نہیں بلکہ ان کا فن فلسفہ پر چھایا ہوا ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ غالب اپنی فنی، علمی اور تخلیقی بصیرتوں سے غزل کی روایت کا دامن نہیں چھوڑتے اور دشنہ و خنجر اور بادہ و ساغر کی آڑ لے کر اس قسم کے مضامین بیان کرتے چلے جاتے ہیں کہ طبیعت پھڑک اٹھتی ہے ——!

غالب حیات اور کائنات کے مسائل فلسفیانہ نگاہ سے دیکھتے ہیں ان پر غور کرتے ہیں اور سوچتے ہیں —— حیات و کائنات کے اسرار و رموز بھی ان کے یہاں ہیں۔

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے　　یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے
نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا　　آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں　　ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

سبزہ و گل کہاں سے آتے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے؟

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود،
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

غالب کائنات کے ارتقا کے بھی قائل ہیں اور استدلال سے کام لیتے ہیں لیکن انداز وہی ہے۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

اسی لئے غالب انسانی فطرت کا یہ خاصہ بتلاتے ہیں کہ وہ نت نئی آرزوؤں کو جنم دیتا ہے اور خواہشات گھڑتا رہتا ہے —— اور اس کا سلسلہ شوق کبھی کم نہیں ہوتا!

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

نہ ہو گا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
مری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آئے

غالب کے نزدیک وہ شاعر، شاعر ہی نہیں جو فطرت کے ڈھکے چھپے رازوں پر سے پردہ نہ اٹھا سکے —— اگر ایسا نہیں تو سخنوری بچوں کا ایک کھیل ہے۔ وہ خود قطرہ میں دجلہ اور جزو میں کل دیکھتے ہیں۔

ہر بنِ مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خونِ ناب
قصہ حمزہ کا ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

غالب کے ہاں حسن و جمال بھی ہے اور برتری و جلال بھی۔ ان کی شاعری زندگی سے لبریز ہے اور حسن و عشق کی وہ کیفیات بیان ہوئی ہیں کہ شعر تک جھومنے لگتا ہے۔

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دکھتے ہیں آج اس بت نازک بدن کے پاؤں

ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی!
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قد دلکش سے جو گلزار میں آوے

کیوں نہ ٹھہریں ہدف ناوک بیداد کہ ہم
آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

غالب پُرخلوص ہیں جسے چاہتے ہیں بے پناہ چاہتے ہیں۔ چاہت کی انتہا تک پہنچ جاتے ہیں اور جان تک قربان کرنے پر تل جاتے ہیں اس کا زندگی کی آخری حد تک ساتھ نہیں چھوڑتے۔ پیمان وفا باندھے رکھتے ہیں۔

چھوڑوں گا میں نہ اس بت کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

جان تجھ پر نثار کرتا ہوں!
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی،

پلا دے اوک سے ساقی، جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

پھر دیکھیے انداز گل افشانی گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں!
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں،

ترے سرو قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

جلتا ہے دل اکہ کیوں نہ ہم اکبار جل گئے　　　اے ناتمامیٔ نفسِ شعلہ بار حیف!

غالبؔ کا کلام آفاقی ہے۔ انہوں نے جذبات اور احساسات کی سچی اور حقیقی تصویریں کھینچی ہیں، وہ انسان کے دل اور ذہن کی پرچھائیاں ہیں۔ اس کی رُوح کی پکار ہے ان تصویروں میں غالب نے جس چیز کو پیش کیا ہے وہ انسانیت کے ہم آہنگ ہے۔ انسان یگوں سے ان کیفیات کی شاہراہ پر سے گزر رہا ہے۔ اور گزرتا ہوا چلا جائے گا، یہ اس کے ذہن کی بازگشت ہے، جو قیامت تک مشرق، مغرب اور شمال جنوب سے گھری ہوئی دنیا کی وسعتوں میں تیرتی ہی رہے گی۔

دنیا کتنی بدل جائے یہ احساسات چھاتے ہی رہیں گے۔ یہ غالب کی آپ بیتی نہیں، آج اور آئندہ کے انسان کی "بیتی" ہے۔ اس کا یہ کلاسکی انداز اسے زندہ جاوید رکھیگا۔

غالبؔ کی غزل ساخت کے اعتبار سے بھی متناسب ہے۔ ان کی غزل میں حسن و تناسب کی بیشتر صفات ہیں، بیجا طوالت سے انہوں نے حذر کیا ہے۔ اختصار، ایجاز، اجمال اور ایمائیت انہیں عزیز ہے۔ ان کی غزلوں میں اکثر نو یا دس شعر ملتے ہیں۔ فن کے پرکھنے والوں نے غزل کے لئے تقریباً اتنے ہی اشعار کی تعداد متعین کی ہے۔ غالبؔ کے مقابلے میں میرؔ کے ہاں طوالت کا عیب زیادہ پایا جاتا ہے اور اس بیجا طوالت نے میرؔ کی غزل کو پست کر دیا ہے۔ اپنی غزل کی طوالت سے میرؔ خود بھی آگاہ کرتے ہیں۔

گر غزل ہو گئی قصیدہ سی
عاشقوں کا ہے طولِ حرف شعار

غالبؔ اس بدعت سے بچے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ہر صورت غزل کی ساخت کا احترام کیا ہے اور یہ بھی ان کے حق میں جاتی ہے

اُردو شاعری میں غالبؔ ہی ایک ایسے نغمہ سنج ہیں جن کی فکر سے علامہ اقبال بے حد

متاثر ہیں۔ اگر ہم علمی، فکری اور فنی بصیرتوں کا تقابلی جائزہ لیں تو ہمیں ان دونوں عظیم شاعروں کی طبیعتوں میں عجیب تطابق اور تشابہ نظر آئے گا۔ یہ درست ہے کہ علامہ اقبال پہلے داغ کی طرف جھکے تھے لیکن چونکہ داغ اور اقبال میں کوئی ذہنی اور فکری مناسبت نہیں — اس لئے اقبال بڑے اطمینان سے اپنا دامن سمیٹ کر غالب کی طرف مائل ہوئے۔

اردو شاعروں میں اقبال، غالب سے متاثر ہیں اور انہوں نے ان سے فیض اٹھایا ہے۔ اردو ہی کیا، فارسی میں بھی غالب کے ایسے کتنے ہی متبسم اشعار ہیں جن کی رعنائیاں نچوڑ کر اقبال نے اپنی شاعری کے ساغر، بھادوں سمائے ہیں۔ دونوں شاعروں کے فارسی اشعار ایک ہی قسم کے الفاظ پر مشتمل ہیں۔ اور ہم معنی ہیں ——— خیال بھی متفق ہے۔ مثال کے طور پر دونوں ذہنی پختگی کے مقابلے میں باطنی شعور کی طرف مائل ہونے کے اشارے کرتے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں ؎

ہر معنیٔ پیچیدہ در حرف نمی گنجد
ہر لحظہ بہ دل در شو شاید کہ تو دریابی

غالب فرماتے ہیں ؎

یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے کہ غالب
کروں خوانِ گفتگو پر دل و جاں کی میہمانی

اقبال پھر گویا ہوتے ہیں ؎

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

غالبؔ نے بھی فارسی میں بعینہٖ کہا ہے

سخن ما ز لطافت نہ پذیرد تحریر
نشود گرد نمایاں ز رمِ توسنِ ما

اردو کی مثال لے لیجئے کس قدر ٹپکتی ہے ــــ دونوں کے خیال کے مطابق ہر فن، اثر آفرینی کے لئے فنکار کے خلوص اور احساس کی صداقت کا رہین منت ہے!

اقبالؔ

رگوں میں گردش خوں ہے اگر تو کیا حاصل
حیات سوزِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں

غالبؔ

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

اقبالؔ

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

~~~~~~

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

غالبؔ

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی،
~~~~~~

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

اسی طرح اور کتنی ہی مثالیں ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ غالب کا کلام بھی مقصدیت لئے ہوئے ہے اور وہ بغیر مقصد سوچے سمجھے بات نہیں کرتے۔ یہ الگ بات ہے کہ اقبال کی مقصدیت متعین ہے وہ حکیمانہ انداز میں سوچتے ہیں ——— اور غالبؔ رندانہ انداز میں، لیکن اس میں بھی مقصدیت ہوتی ہے۔
غالبؔ نے کہا تھا۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اقبالؔ نے اسی کو یوں کہہ دیا ہے۔

صورت گرے کہ پیکرِ روز و شب آفرید
از نقشِ ایں و آں بتماشائی خود رسید

اقبال رجائیت پسند ہیں۔ مجموعی طور پر غالب بھی قنوطی نہیں اقبال زندگی کو کشمکش سے تعبیر کرتے ہیں اور خطرات، مصائب اور مشکلات کو حیات و بقا کے لئے لازمی گردانتے ہیں ——— ادھر غالبؔ کے نزدیک بھی موت سے پہلے غم سے نجات نہیں ملتی۔

اقبال

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

غالبؔ

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

کم نا کشتہائی ہستی سے کرے کیا سعی آزادی
ہُوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصت روانی کی

اقبال خودی کے قائل ہیں، اور غالب خود بین ہیں۔ بقول حالی مرزا (غالب) خودداری وحفظ وضع کا بہت لحاظ رکھتے تھے۔"

اقبال

خودی کیا ہے راز درون حیات
خودی کیا ہے بیداری کائنات

غالب

بندگی میں بھی وہ آزادہ وخود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہُوا

علامہ اقبال عالمگیر اخوت کے حامی ہیں۔ غالب بھی کم نہیں وہ بھی رنگ و رُوپ نسل وگروہ اور وطن سے بے نیاز ہیں۔ اعمال اور انسانیت پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

اقبال

بُتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ افغانی رہے باقی نہ ایرانی نہ تورانی،

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزادِ وطن صُورتِ ماہی

"اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے"

غالب

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

ہرچند کہ عشق، اضطراب، کرب، بے چینی، اضمحلال کا امین ہے۔ اس کے فیض سے بے چینیاں اور بیقراریاں میسر آتی ہیں۔ خونِ جگر چوسنا پڑتا ہے۔ روح کو پگھلایا جاتا ہے۔ لیکن ان باتوں کے باوجود محبت میں آسودگیاں ہیں۔ راحتیں ہیں اور ایک عجیب سا کیف و مزہ ہے۔

اقبال

ایں حرف نشاط آور ما می گویم و می رقصم
از عشق دل آساید با ایں ہمہ بیتابی

عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے
برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

غالب۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا!

معرفتِ ذات پر دونوں بزرگ زور دیتے ہیں اور اعتماد کی تلقین کرتے ہیں۔

اقبال :-

حسن کا گنج گرانمایہ تجھے مل جاتا
تو نے فرہاد نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل

غالب

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

غرضیکہ اس قسم کے ان گنت اشعار ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دونوں عظیم شاعروں میں بڑی حد تک فکری یگانگت اور تخیلی مناسبت ہے۔ اقبال نے غالب سے اکتساب فیض کیا ہے ——— ان کے اشعار میں کہیں کہیں غالب کی روح دکھائی دیتی ہے ——— اقبال کے "لالہ کے پھول" غالب ہی کے جگر کے ٹکڑے ہیں غالب کے لہو کی بوندوں نے اقبال کے یہاں پھیل کر ارغوانی شفق کا روپ دھار لیا ہے ——— !

یہ دوسری بات ہے کہ غالب کے فلسفہ میں شعریت نمایاں ہے۔ اور اقبال کے ہاں فلسفہ اور شعریت دونوں پہلو بہ پہلو رواں ہیں۔ بہر حال کچھ بھی ہو اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ اقبال غالب کے خوشہ چینوں میں سے ہیں -

اور سچ تو یہ ہے کہ غالب کی سجل اور کھنکتی غزل صدیوں کی ریاضت کے بعد کہیں، فلک کے ان دیکھے سبز گوں گوشوں میں چھپے ہوئے فردوس سے اتری ہے۔

غالب کی غزل ارض مشرق کا روشن اور نیلا نیلا، امرت برساتا ہوا چاند ہے جو اپنی نیلگوں ضیا پاشیوں سے شعر و سخن کی کائنات میں نور کے خوش گوار جھونکے اڑا رہا ہے۔ یہ چاند صدیوں روشنیوں کا گہوارہ ہے اس کی سنہری آغوش سے یونہی اسی طرح، امرت برستا رہے گا ——— ہمیشہ ——— ہمیشہ ———

اور اگر کبھی وقت کی کوکھ سے گھٹائیں گھمنڈ گھمنڈ اٹھیں بھی، تو ان گھٹاؤں کے سنگھاسن پر، اپنا نیلگوں مکٹ، تابناک پیشانی پر سجائے، یہ چاند اور زیادہ دلکش، اور زیادہ مدھر اور زیادہ لطیف دکھائی دے گا —— اس کا حسن اور زیادہ بھڑک اٹھے گا —— اس کے نور کے تلاطم میں اور زیادہ شدت در آئے گی —— جوبن، اور دلربائی میں اضافہ ہوگا۔

جس طرح فردوسی نے شاہنامہ لکھ کر ایران کو ابدی زندگی عطا کی ہے۔ اسی طرح غالب نے "اپنا دیوان" تخلیق کر کے پاک و ہند کو امر بنا دیا ہے۔ الحق، اردو سخن گستری میں، غالب —— غالب ہی رہے ہیں۔

قصیدہ اور اس کا ارتقاء

آج قصیدہ مر چکا ہے اور اس کا
حسین لاشہ وقت کے مزار پہ دھرا ہے

قصیدے کی ظاہری صورت وہی ہے جو غزل کی ہوتی ہے۔ دونوں میں فرق موضوع اور اشعار کی تعداد کا ہوتا ہے۔ غزل کا ہر شعر اپنے اندر پورا مضمون سمیٹے ہوئے ہوتا ہے اور اس کی اساس حسن وعشق کے معاملات پر رکھی جاتی ہے۔ لیکن قصیدے میں کسی کی مدح یا ہجو ہوتی ہے۔ علاوہ بریں غزل کے مقابلے میں قصیدہ بیحد طویل ہوتا ہے اور کئی کئی سو اشعار پر مشتمل ہوتا ہے۔ چنانچہ خاقانی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

قصیدہ کے لغوی معنی مغز سطبر (دلدار گودا) کے لکھے ہیں اور اصطلاح شاعری میں اس نظم کو قصیدہ کہتے ہیں جس میں کسی کی ستائش یا بُرائی، یا وعظ ونصیحت یا حکایت وشکایت وغیرہ بیان ہوئی ہو۔ قصیدہ کی وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ چونکہ اس میں ایسے مضامین ارفع و عالی بیان ہوتے ہیں، جو طبعی مذاق کے لئے لذت گیر و فرحت بخش ہوتے ہیں اس لئے اسے قصیدہ کہتے ہیں — قصیدہ معنی، مضمون، شکوہ اور تخیل کی بلند پروازی کی وجہ سے دوسری اصناف میں ممتاز ہے — جس طرح جسمانی اعضا میں سر اور مغز سر کو نمایاں حیثیت میسر ہے اسی طرح قصیدہ کو مغز سخن سمجھ کر قصیدہ کے نام سے نوازا گیا ہے۔

قصیدہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ فارسی میں اسے چامہ بھی کہتے ہیں۔ اُردو میں یہ صنف قصیدہ ہی کہلاتی ہے۔ عربی کے محاورے میں قصیدے کو ردیف یا قافیہ کے آخری حرف کی نسبت سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر قافیہ کا آخری حرف م ہے تو اسے میمیہ کہیں گے۔ اگر ل ہے تو لامیہ اگر ج ہے تو جیمیہ ——

اسی طرح مضامین کی رُو سے بھی قصائد کے مختلف القاب ہیں۔ تشبیب میں اگر پھولوں، کلیوں، شگوفوں، غنچوں، سبزہ یا بہار وغیرہ کا ذکر ہے تو بہاریہ اور اگر اس میں شرح حال۔ زمانے کے خلاف شکوہ شکایت ہے تو حالیہ اور اگر حسن وعشق کے معاملات وکیفیات بیان ہوتی ہیں تو عشقیہ اور اگر فارسی قصیدہ گو عُرفی کی طرح کسی نے اس میں اپنے فخر وفن کا مظاہرہ کیا ہے تو اسے فخریہ کہیں گے۔

قصیدہ کے چار حصے ہوتے ہیں اور قصیدہ کی ابتدا بھی غزل کی طرح مطلع سے ہی ہوتی ہے۔

قصیدہ کا اولین یا ابتدائی حصہ تشبیب کہلاتا ہے۔ دوسرے حصے کو تخلص یا گریز کہتے ہیں —— تیسرا حصہ ممدوح کی ذات وصفات وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے اور چوتھے حصے میں جس پہ قصیدہ کا اختتام ہوتا ہے۔ ممدوح کو دعا دیجاتی ہے۔ ——

قصیدہ کے ابتدائی حصے یعنی مطلع یا تشبیب سے مراد وہ اشعار ہیں جو قصیدے میں تمہید کے طور پر لکھے جاتے ہیں —— تشبیب کے معنی شباب کے تذکرہ کے ہیں عربوں کے ہاں حسن وعشق کے معاملات اور موثر جذبات کے اظہار کے لئے قصیدہ کے علاوہ اور کوئی صنف نہیں تھی۔ اس لئے انہوں نے قصیدے کے ابتدائی حصے (یعنی تشبیب) کو اس قسم کے مضامین کے لئے مخصوص کرلیا تھا۔ بعد میں اس میں وسعت اور پھیلاؤ پیدا ہو گیا اور حسن وعشق کے علاوہ

سحاب و بہار، شکوہ شکایات، اور اسی قسم کے دوسرے عنوانات بھی اس میں شامل ہو گئے —— تمہید میں وسعت اور کشادگی تو ضرور پیدا ہو گئی لیکن نام اس کا وہی تشبیب ہی رہا۔

تشبیب کے بعد قصیدہ کا دوسرا مرحلہ جسے تخلص یا گریز کہتے ہیں، بڑا اہم مرحلہ ہے یہاں سے شاعر اپنے اصل مدعا اور مطلب کی طرف پلٹتا ہے اور اپنی صلاحیتوں اور فنی بصیرتوں سے تشبیب کے غیر متعین مضامین کو مدح وغیرہ کی طرف لوٹاتا ہے۔ گریز کی بڑی خوبی یہی ہے کہ تمہید (تشبیب) کو مدح سے اس طرح جوڑا جائے کہ طبیعت میں معمولی سی اُلجھن بھی پیدا نہ ہو۔

قصیدہ کا تیسرا حصہ جسے مدح کہتے ہیں اس میں ممدوح کی ذات صفات اور دوسری خصوصیات کی مدح کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ممدوح سے متعلقہ چیزوں کی بھی ستائش اور تعریف کی جاتی ہے مثلاً ممدوح کی فوج، اس کی تلوار، سپر، تیر، تفنگ گھوڑا، ہاتھی، اس کا عدل، دادگستری، سخاوت، شجاعت، عظمت، قربانی وغیرہ غرضیکہ تمام متعلقات کا بیان آجاتا ہے۔

قدیم قصیدہ ممدوح کے ممتاز اوصاف اور خوبیاں بیان کرنے پر اکتفا کرتا تھا لیکن بعد میں مدح یا ذم ایک رسمی سی چیز بن کر رہ گئی۔

قصیدہ کا چوتھا یعنی آخری حصہ مقطع کہلاتا ہے اور اسی پر قصیدے کا اختتام ہوتا ہے۔ اس حصہ میں ممدوح کے حق میں دُعا کی جاتی ہے۔

قصیدہ کی اس ترتیب میں متقدمین اور متاخرین شعرا حسب مذاق کمی بیشی کرتے رہے ہیں یعنی کسی نے تمہید یا تشبیب کا التزام کیا اور کسی نے بغیر تمہید یا تشبیب، اپنا اصل مدعا بیان کرنا یا تعریف کرنی شروع کر دی۔

قصیدے کے ان چاروں ارکان کے بعد اب یہ دیکھنا ہے کہ کسی قصیدہ کی

شان و شوکت اور اس کا حسن و جمال کن باتوں کا رہینِ منت ہے یا قصیدہ کن چیزوں سے تزئین اور آرائش پاتا ہے۔

اچھے قصیدہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے چاروں ارکان کی سختی سے پابندی کی جائے اور ان میں اپنی لیاقتوں اور سوجھ بوجھ سے حُسن و رعنائی پیدا کی جائے اور ان کا تسلسل قائم رکھا جائے۔ وہی قصیدہ صحیح معنوں میں قصیدہ کہلانے کا مستحق ہے۔ جس کے چاروں ارکان مضمون آفرینی، شدت جذبات، حسن ادا اور تخیل کی جہانبانی سے تال میل کھاتے ہیں۔ چاروں ارکان میں سے اگر کسی کے رنگ زیادہ شوخ یا زیادہ پھیکے ہوں یا ان میں توازن قائم نہ رہے تو قصیدہ کا جمال ماند پڑ جاتا ہے قصیدے کے لئے تسلسل، نظم و ضبط اور ہم آہنگی انتہائی ضروری ہے۔

جس قصیدہ میں فکر کی اڑان، جدت و ندرت، مضمون بندی، ژرف نگاہی، واقعہ نگاری، شاندار اور اچھوتی عربی فارسی ترکیبیں، استعارات، تشبیہات، تلمیحات کی دلکشی و دلپذیری، معنویت میں بھرم اور رکھ رکھاؤ، خیالات میں شادابی و شگفتگی الفاظ میں آن بان اور سج دھج ہوگی۔ وہی قصیدہ فن کے لحاظ سے بہتر ہوگا سلاست، جزالت، عذوبت، فصاحت، حلاوت، نمکینیت، سحر بیانیاں، خیال آرائیاں، موشگافیاں، واقفیت و صداقت کا اظہار —— برجستہ اور شستہ الفاظ کا استعمال، شان و شوکت کا بہاؤ اور روانیاں —— خارجیت اور داخلیت کی ضوفشانیاں۔ الفاظ کی شعبدہ بازیاں اور فکر کی عیاریاں اور تاثر خیزی —— ان میں جس قدر تیزی اور شدت ہوگی، قصیدہ کا آپا اسی قدر جگمگائے گا۔

قصیدہ میں ابتذال، رکاکت اور سوقیانہ انداز سے پرہیز کرنا چاہیئے —— اس میں آورد نہ ہو —— مبالغہ اور جھوٹ سے قصیدہ کی قدریں گھٹ جاتی ہیں۔ ——

قصیدہ عربی زبان سے فارسی میں آیا ہے۔ سرزمین ایران میں یہ صنف اس قدر پھلی پھولی کہ سامانیوں، غزنویوں اور سلجوقیوں، کے دربار اس صنف کی جگمگاہٹ سے جگ مگ جگ مگ کر اُٹھے ——!

رودکی، ظہیر فاریابی، انوری، خاقانی شروانی، محتشم کاشی، عُرفی، قاآنی وغیرہ کا فارسی کے بہترین قصیدہ گو شعرا میں شمار ہوتا ہے —— قدما میں انوری قصیدے کے بادشاہ ہیں۔

در شعر سہ تن پیمبر انند   ہر چند کہ لانبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را   فردوسی و انوری و سعدی

عجمیوں کے مقابلے میں عربوں کے قصیدے سننے والوں کو بہت زیادہ متاثر کرتے تھے —— اس کی وجہ یہ ہے کہ عربوں نے کبھی کسی کی بیجا تعریف نہیں کی، ایرانی مبالغہ، جھوٹ اور تکلف سے کام لیتے تھے۔ بڑے بڑے انعام پانے کی اُمید میں ناجائز تعریفوں کے طومار باندھ دیتے تھے —— عرب ان بدعتوں سے بچے ہوئے تھے انہوں نے کبھی کسی کی فضول ستائش نہیں کی —— وہ اگر کسی کی مدح کرتے بھی تھے تو انعام لینا گوارا نہ کرتے تھے۔

ایک دفعہ ایک رئیس نے ایک عرب شاعر سے کہا "میری مدح میں کچھ لکھو"۔ شاعر نے جواب دیا "تم کچھ کر کے دکھاؤ تو میں کہوں"۔

عرب کا مشہور شاعر میمون بن قیس جو رودکی اور ہومر اور ملٹن کی طرح اندھا تھا۔ اور اپنے اندھے پن کی وجہ سے اعشیٰ کہلاتا تھا، اس کے کلام کی تاثیر ضرب المثل تھی۔ وہ جس کی ستائش کرتا تھا اس کی دھومیں مچ جاتی تھیں۔ اور جس کی بُرائی کرتا تھا وہ ذلیل و زبوں ہو کر رہ جاتا تھا —— ایک دن اس اندھے شاعر کے پاس ایک افسردہ سی عورت آئی اور کہنے لگی کہ میں کئی لڑکیوں کی ماں ہوں اور میری

لڑکیوں کو بر نہیں ملتے ـــ بس پھر کیا تھا اعشیٰ نے ان لڑکیوں کی مدح میں ایک قصیدہ کہا جس کی وجہ سے ان کے حسن و جمال اور سیرت کی تشہیر ملک بھر میں ہو گئی ـــــ بڑے بڑے اُمراء اور رئیس ان لڑکیوں کے لئے مضطرب اور بے چین ہو اُٹھے اور اس طرح ان کی شادیاں ہو گئیں۔ غرضیکہ اس طرح کے کتنے ہی واقعات ہیں جو قصیدہ کی اثر انگیزی سے عمل میں آئے۔

فارسی شعرا کی قصیدہ سرائی بھی اپنے تاثرات سے خالی نہیں۔ ان کے ہاں بھی ایسی کئی مثالیں ہیں ـــ مثال کے طور رودکی کا یہ قصیدہ۔

بوی جوی مولیان آید همی ــ یاد یار مهرباں آید همی
ریگ آموی و درشتی های آن ــ زیر پایم پرنیان آید همی
ای بخارا! شاد باش و شاد زی ــ میر سویت میهمان آید همی
میر ماه است و بخارا آسمان ــ ماه سوی آسمان آید همی
میر سرو است و بخارا بوستان ــ سرو سوی بوستان آید همی
آب جیحوں با همه پهناوری ــ خنگ ما را تا میان آید همی

اس قصیدہ کو سن کر امیر نصر بن احمد سامانی بخارا کی طرف ننگے پاؤں ہی دوڑ پڑا تھا۔

اُردو قصائد

جس طرح ایرانی سخن آرائی میں قصائد کے خزانے موجود ہیں۔ اس طرح اُردو میں نہیں۔ یہاں تو صرف کچھ موتی ملیں گے خزانے کہاں؟ —— فارسی سخنوروں میں کئی ایک تو غرض سخن میں صرف قصائد ہی رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس اُردو میں ایسا کوئی شاعر نہیں جس نے صرف اسی صنف سے اپنی شاعری کے لئے بہاریں طلب کی ہوں —— لے دے کے اردو میں ایک ہی ایسی ہستی ہے جسے قصیدوں کا سرتاج کہا جاتا ہے۔ یعنی سودا —— لیکن انہوں نے بھی چھوٹے بڑے کل اکتالیس قصیدے کہے ہیں باقیوں کا تو ذکر ہی کیا۔

جنوبی ہند (دکن)

اردو قصیدہ کی چھان بین کرنے کے لئے ہمیں سب سے پہلے دکن کے چار سو سال (۱۳۵۰ء-۱۷۵۰ء) کے لیل و نہار کو کھنگالنا ہوگا —— جنوبی ہند کے باسیوں نے اردو زبان کی شروع میں جس قدر خدمت اور نشوونما کی ہے شاید ہی کسی اور خطے کے سپوتوں نے کی ہو ——!

دکن کے تمدن اور ادب کی تعمیر و تشکیل میں بہمنیوں نے سب سے زیادہ حصّہ لیا ہے۔ انہوں نے اپنی حکمت عملی اور دانش گاہی سے مہاراشٹر، کرناٹک اور تلنگانہ تینوں لسانی علاقوں کو ایک ریاست اور ایک حکومت کے تحت متحد کیا —— اور اس طرح ۱۳۴۷ء سے ۱۵۲۵ء تک ادب و سیاست کی خلوص دل سے رہنمائی اور دستگیری کی اور اپنے بعد ایسی مستقل یادگاریں چھوڑیں جو ہمیشہ ان کی یاد دلوں میں تازہ رکھیں گی ——!

اُردو زبان اور ادب اسی خاندان کی سرپرستی میں بحیرہ عرب سے لے کر بحیرہ بنگال تک رائج ہوا۔ اور نیلے پانیوں میں گھرے ہوئے اس وسیع خطے کی

آغوش میں جگہ جگہ اس کے مرکز قائم ہوئے جن میں گلبرگہ، بیدر، گوگی۔ احمد نگر، بیجا پور، گولکنڈہ، کرنول کڑپہ، ویلور، مدراس، بودھن اور اورنگ آباد کے نام تاریخ ادب اردو میں آج بھی احترام سے لئے جاتے ہیں اور ہمیشہ یاد رہیں گے۔

اسی طرح اردو زبان کی خدمت میں عادل شاہیوں (۱۴۹۰ - ۱۶۸۶ء) اور قطب شاہیوں (۱۵۰۸ - ۱۶۸۷ء) نے بھی کوئی کوتاہی نہیں کی بلکہ اپنی استعداد سے بڑھ کر اس کے ناز و نخرے اٹھاتے۔ اور اسے سہاگن بھی کر اپنے جگر و دل کے گاڑھے لہو سے اس کی مانگ میں سیندور بھرا ـــــ اسے جمال و رعنائیاں بخشیں۔

اس کے بعد ان میں انتشار اور افراتفری کے دور کا آغاز ہوتا ہے اورنگ زیب کی مغل فوجیں فتح و نصرت کی پھریریں اٹھائے ہوئے اس سرزمین میں داخل ہوتی ہیں، جس سے تہذیب و شائستگی اور علم و ادب کی بنیادیں تک ہل جاتی ہیں ـــ لوگ شعر و سخن کے گہوارے چھوڑ چھوڑ کر ادھر ادھر بھٹکنے لگتے ہیں ـــــ یہ سبھی کچھ ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی حیدر آباد اور اورنگ آباد کے جیالے سپوت اردو کے سر سے اپنے ہاتھ نہیں اٹھاتے ـــــ اور جہاں تک ان سے بن پڑی اس کی مانگ پٹی سنوار نے میں اپنی لگن کا اظہار کرتے ہیں۔

چونکہ ہمارا موضوع "قصائد" ہے اس لئے ہم ادب کے دوسرے پہلوؤں کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنے مخصوص موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں جنوبی ہند کے ان چار سو سالوں میں مختلف سلطنتوں کے تحت جن اردو قصیدہ گو شعرانے اس صنف کی خاطر اپنے آپ کو اجاگر کیا، ان کی ترتیب اس طرح سے دی جاسکتی ہے۔

بہمنی عہد، گلبرگہ، بیدر (۱۳۵۰ - ۱۵۲۵ء) نظامی بیدری، اشتیاق لطفی

عادل شاہی عہد۔ بیجاپور (۱۴۹۰۔ ۱۶۸۶ء) قطب رازی، کمال خاں رستمی ملک خوشنود، محمد عادل شاہ ثانی، ملک الشعراء ملا نصرتی، شاہ امین الدین اعلیٰ۔
شاہی عہد، گولکنڈہ، حیدرآباد (۱۵۰۸۔ ۱۶۸۷ء) محمد قلی قطب شاہ حسن شوقی،
قطب عہد۔ حیدرآباد اورنگ آباد (۱۶۸۷۔۱۷۵۰ء) ولی۔ عاصی اس کے بعد ادب کا یہ گہوارہ، شمالی ہند میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اب ہم ان قصیدہ گو شعرا پر اسی ترتیب سے تفصیلی نگاہ ڈالتے ہیں۔

نظامی بیدری وہی شاعر ہے جس نے سب سے پہلے عشق و عاشقی کے موضوع پر ایک طویل مثنوی پدم راؤ لکھی۔ نظامی بیدری نظام شاہ بہمنی کے عہد کا شاعر ہے۔

نظامی قصیدہ گو شاعر نہیں ہے۔ لیکن یہاں اس لئے اس کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ اردو میں سب سے پہلے بادشاہ (سلطان علاؤالدین بہمنی) کی مدح اسی شاعر نے کی ہے ــــ بطور نمونہ چند شعر پیش کئے جاتے ہیں تاکہ اس زمانے کی زبان اور انداز کا پتہ چل جائے (ویسے یہ قصیدہ نہیں ہے)

بڑا شاہ وہ شاہ جس شاہ جگ — دہیں بیوتے جوم تس پاتے لگ
انہیں شہ کیا شاد وکھت دھرن — گگن دل دھرت دِل مسخر کن
عطارد مسخر ہوا اسے قلم — مسخر کیا سور دے ہت علم
علم لگ گگن سور چلی سوا چاو — طبل ڈھول برغوں بدل توں بجاؤ
چمکنے لگے جب کنک ہت تبر — چڑھاوا کیا دھرت آکاس پر

حقیقت کی نگاہ سے اگر دیکھا جائے تو موجودہ معلومات کے لحاظ سے مشتاق اول قصیدہ گو ہیں ــــ یہ سلطان محمد شاہ لشکری بہمنی (متوفی ۱۴۸۲ء) کے آخری زمانے کے شاعر ہیں ــــ انہوں نے غزلوں کے علاوہ قصیدے بھی کہے ہیں جن کے بہترین نمونے موجود ہیں انہوں نے سید برہان الدین شاہ خلیل اللہ کی مدح میں جو اردو کے

قصیدہ لکھا تھا وہ اب تک محفوظ ہے ـــــــ زبان وہی نظامی بیدری کی سی ہے ـــــــ نامانوس اور اجنبی سی ـــــــ

لطفی بھی اسی دور کا شاعر ہے اور شتاق کا ہمعصر ہے۔ اس قصیدہ گو شاعر نے شاہ محمد کی مدح کی ہے جو خلیل اللہ بت شکن کی اولاد میں سے تھے۔ لطفی کے قصیدے محفوظ ہیں۔ لطفی نے خواجوئے کرمانی کے اس مشہور قصیدے کی زمین میں بھی ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا مطلع ہے۔

قرطۂ زرچاک زد لعبت سیمین بدن

رشک لمع نشاند شمع مرصع لگن !!

لطفی کے قصیدے کے چند شعر

چار پہر برقرار پونچ رہیا تھا سنگار

غرب کے کوتے تے ڈول ڈبایا رسن

ین سورج جھال تھے لعل ہوئے سرگ کے

رین کا کاجل منگا نین میں کھنچیا انجن

سرگ تھے نکلیا چندر لعل لہو کے بھتر

سور چھپایا خنجر چندر دکھایا مکھن

چندر کا بالا بچہ رین کی دائی اچھپا !

مشک و عنبر میں چھپا چاند کے لکھے اکھتن

سرگ کا طوطی ہریا مشک خطائی چڑیا

رات کا عنبر سریا صبح کی پھوٹی کرن

لطفی کے بعد ہمیں عادل شاہیوں کے عہد میں قطب رازی کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے خود تو کوئی قصیدہ نہیں لکھا۔ البتہ سید راجو حسینی کے فارسی قصیدے سے

تحفۃ النصائح کا اسی نام سے ۵۲ء ۱۶ میں اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اس قصیدہ میں ۸۶، شعر ہیں اور یہ ۴۵ باب پر مشتمل ہے ـــــ زبان صاف اور سلیس ہے۔

نمونہ

تحفہ اصل اُسے فارسی سب ترجمہ دکنی کیا
صاحب سو دنیا دین کے شہ ابوالحسن
بندیاں میں سب کمترا ہے رازی تخلص قطب کا
تحفہ کیا دکنی زبان شہ کی رضا لے سبس اور
بندہ تو سب پر عیب ہے، جو بخشے عیب توں
بندہ نوازی شاہ سوں اد عیب کھووے سب ہنر
ہجرت سے دس سو سال ہور چالیس پر بھی پانچ تھے
تب اُسے مرتب سو ہوا تحفہ سو دکھنی نامور

کمال خاں رستمی بھی اسی عہد کا شاعر ہے اُسے جملہ اصناف سخن میں کمال حاصل تھا۔ ـــــ اُردو نثر بھی لکھی تھی ـــــ قصیدہ کے علاوہ اس کی ایک طویل ترین مثنوی بھی ہے جو شاہنامہ فردوسی کی طرز پر ہے۔ اس میں حضرت علی کی لڑائیاں بیان کی گئی ہیں۔

ملک خوشنود بھی اسی دور کا شاعر ہے۔ یہ اصل میں گولکنڈہ کا غلام تھا۔ جو خدیجہ سلطان کے جہیز میں شادی کے ساتھ گولکنڈہ سے بیجاپور بھیجا گیا تھا۔ بعد میں اُسے سفیر بنا کر (۱۶۳۵ء) گولکنڈہ بھیج دیا گیا تھا ـــــ یہیں گولکنڈہ میں ملک خوشنود نے سلطان عبداللہ کی ستائش میں ایک عمدہ قصیدہ پڑھا اور بیش بہا تحائف حاصل کیے اس قصیدے کے علاوہ ملک خوشنود نے اور بھی بہت سے قصیدے لکھے ہیں۔

علی عادل شاہ ثانی (۱۶۵۶ - ۱۶۷۲ء) اردو کا بہت بڑا اور اچھا شاعر تھا۔ اس کا اردو میں مکمل دیوان موجود ہے۔ علی عادل شاہ، شاہی تخلص کرتا تھا۔ اس نے غزلوں اور مثنویوں کے علاوہ قصیدے بھی لکھے ہیں۔

شاہی کے فوراً بعد ہی نصرتی کا نام آتا ہے نصرتی علی عادل شاہ کے دربار کا ملک الشعراء تھا۔ قصیدہ نگاری میں اسے کمال حاصل تھا۔ دکن کا کوئی شاعر قصیدہ نگاری میں اس کا ہم پلہ نظر نہیں آتا۔

(دکنی ادب کی تاریخ۔ زور)

نصرتی کو بیجاپور دربار میں وہ عزت اور رتبہ حاصل تھا جو کسی دکنی شاعر کو کسی جگہ حاصل نہیں ہوا۔ وہ ہر وقت عادل شاہ کے ساتھ رہتا۔ رزم و بزم دونوں میں اس کا شریک تھا۔ نصرتی نے عادل شاہ ثانی کی ستائش میں کئی قصیدے لکھے۔ جو بعد کے دور کے قصیدوں سے اس لئے ممتاز ہیں کہ وہ سادہ اور اصلیت پر مبنی ہیں۔ نصرتی پر بھی ہندی اور دکنی کے اثرات چھائے ہوئے ہیں۔ زبان وہی ہے جو مثنوی اور غزل میں برتی گئی ہے لیکن پھر بھی قصیدے فن کے معیار پر پورے اترتے ہیں ان میں کہیں کہیں عربی فارسی کی تشبیہات و تلمیحات بھی آجاتی ہیں۔ نصرتی نے اپنے ممدوح علی عادل شاہ کے صرف دو سال بعد ۱۶۷۵ء میں وفات پائی۔

قصیدے کا نمونہ (علی عادل شاہ کی مدح میں لکھا ہے)

جب تے جھلک دیکھیا اوک سورج تری تروار کا
تب تے لگیا تھر کانپنے ہو پُر عرق یک بار کا
کوئی بُند جو تیری کھرگ کے پانی کی دریا میں پڑے۔
کھا جوش اوک یک نیر ہوئے تختہ الکنڈ اکگار کا

کس میں تو طالع کے قوی جم تے اوک جم جم ملتے
جس میں تو عالمگیر ہو آیا سکندر سار کا

کوئی مہرۂ سرتج انگے جانباز نہیں لیجا سکے
جاں رزم کے تختے پو توں ششدر بندیا پھل بار کا

ہر فصل شہ کے وصف کی لکھتا تو ہوتے کئی ورق
پڑتا ہوں سرنامہ بڑی یک فتح کی طومار کا

نصرتی کے علاوہ اسی زمانے میں شاہ امین الدین اعلیٰ نے بھی قصیدے لکھے ہیں۔ قطب شاہیوں کے عہد میں گولکنڈہ اُردو کا ایک مرکز بن چکا تھا۔ وجہی، احمد اور غواصی اسی دور کی پیداوار ہیں — محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰-۱۶۱۱ء) بذاتِ خود علم و ادب کا پرستار تھا۔ اور خود فارسی، اُردو اور تلنگی زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ اس کا اُردو کا کلام پچاس ہزار اشعار پر مشتمل تھا لیکن پورا کلام اب محفوظ نہیں — تلنگی مجموعہ کا تو پتہ ہی نہیں البتہ فارسی اور اُردو کا کچھ کلام دستیاب ہو چکا ہے اور اس کا کلیات بارہ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اور شائع ہو چکا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کے ہاں غزلوں، مثنویوں، مرثیوں، رباعیوں اور قصیدوں کے وافر نمونے موجود ہیں۔ بادشاہ ہونے کے باوجود وہ ایک عوامی شاعر تھا۔ زبان میں سادگی سلاست اور بہاؤ ہے۔ محمد قلی ابتدا میں معانی تخلص کرتا تھا بعد میں قطب شہ اختیار کیا۔ قطب شاہ نے بسنت پر بھی بہت سے قصیدے لکھے ہیں۔

نمونہ کلام

بسنت کھیلیں عشق کی آپیارا
تمیں ہیں چاند میں ہوں جوں تارا
پنچھل کندن کے تاراں رنگ جھوتا

بندی ہوں پھند بند سوں کر سنگارا

بسنت کھیلیں ہمن ہور سا جنا یوں
کہ آسماں رنگ شفق پایا ہے سارا

پیا پگ پر ملا کر سب ای پیاری
بسنت کھیل ہوا رنگ سنگارا

نبی صدقے بسنت کھیلیا قطب شہ
رنگیلا ہو رہیا ترلوک سارا

قطب شاہ کے بعد اردو قصیدہ گو شاعروں میں غواصی کا نام آتا ہے۔ غواصی سلطان محمد قطب شاہ (۱۶۱۱ - ۱۶۲۵ء) کے دربار کا شاعر ہے اور اردو شاعروں میں بہت مشہور ہے۔ غواصی نے کو مشہور مثنویاں جن میں "سیف الملوک و بدیع الجمال" بھی شامل ہے، لکھی ہیں لیکن اس کے باوجود قصیدہ گوئی میں اسے بہت ہی اہمیت حاصل ہے۔ غواصی اصل میں قصیدہ گو شاعر تھا۔ گولکنڈہ کے کسی اور شاعر کے اس پایہ کے قصیدے نہیں۔ عبداللہ قطب شاہ نے اس کی بڑی قدر و منزلت کی اور ۱۶۳۴ء میں اسے سفیر بنا کر بیجاپور روانہ کیا تھا۔

بیجاپور میں بھی اس کی بڑی قدر ہوئی اور انعامات حاصل کئے۔ اسی دور میں ایک اور قصیدہ گو شاعر ہو گزرا ہے۔ اس شاعر کا نام حسن شوقی تھا۔ اس نے محمد قطب شاہ کی تعریف میں قصیدے لکھے ہیں۔

اس کے بعد عبداللہ قطب شاہ کے آخری زمانے میں اورنگ زیب کے حملوں کی وجہ سے قطب شاہی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا —— اور پھر ۱۶۸۷ء میں حیدرآباد بھی مغلوب ہو کر مغلیہ سلطنت میں شامل ہو گیا —— ایسے وقت میں بھی ہمیں ایک بوڑھا شاعر ملتا ہے جس کا نام افضل قادری تھا۔ اس نے سلطان عبداللہ کی تعریف میں

قصیدے لکھے تھے :-

اس کے قصیدے کے چند شعر ہیں :-

مرا کہ بھاگ لوچن تے پایا ہے موہن سندر
جلا سورج گلا چندر ستارہ جوت رنگ عنبر
نین گھایل ہے دل زخمی سو تن مجروح سینہ ریش
بو قد برچھا فرنگ سو کا پلک کھوا بھنواں خنجر
سکی ایلی بہتر سلطان عبد اللہ غازی سوں !
کہ جگ آدھار جگ سنگار جگ جھلکار جگ پرور
عہاوانی عہا گیانی عہا چاترعہا جانی !
بلند طالع بلند دانش بلند ہمت بلند اختر
دلیری ہور شجاعت کے بیلے تعریف لکھے لکھے
ملک کاتب فلک کاغذ قلم کہکش بدل مسطر
تجھ ایسے شاہ کون ہونا سو وجہی سار کا شاعر
نپٹ عاقل نپٹ کامل نپٹ گیانی نپٹ گنجبر !
خدا ہور مصطفےٰ ہور مرتضےٰ ہور کل ولی رکھتے
ترے کوٹاں ترے شہراں ترے قلعے ترے کشور
دکھن میں شعر تھا افضل سُلے ایسا نہ تھا خفا
بتا نرم دیتا گرم دیتا پشریں بتا دبسر

اس کے بعد ہمیں ولی اورنگ آبادی کے زمانے تک کوئی قصیدہ نگار دکھائی نہیں دیتا۔ حیدرآباد اور بیجاپور کی محفلیں سنسان ہو چکی تھیں اور اردو کی بہاریں ویرانیوں میں گھری ہوئی تھیں — یہ دونوں جگہیں اجڑیں تو اتنا ضرور ہوا، کہ

یہاں کی رو ٹھی ہوئی بہاریں اورنگ آباد کی زینت بن گئیں۔ اور اورنگ آباد علم و فن اور ادب کا مرکز بن گیا —— ادھر ادھر سے لوگ کھنچ کھنچ کر یہاں آنے لگے —— حیدر آباد اور بیجا پور کے تھکے ہارے شاعر اور صاحب فن لوگ بھی یہیں پہنچنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے اورنگ آباد کی رونقیں دوبالا ہو گئیں —— اورنگ آباد کی یہ حالت تقریباً ایک صدی تک قائم رہی ——!

ولی کی پرورش بھی اسی سجھے ہوئے اور سازگار ماحول میں ہوئی تھی۔

مغل فوجوں کے دکن میں چلے آنے سے یہ تمام علاقہ مغلوں کے تحت آگیا تھا۔ اور شمالی ہند کے تعلقات دکن سے استوار ہو گئے تھے۔ لوگ آنے جانے لگے تھے اس لئے قدرتی طور پر زبان صاف ہوتی چلی گئی۔ ہندی اثرات کا زور بھی ٹوٹا۔ فارسیت، اپنی روایات کے ساتھ اردو میں در آئی —— اور یہی وجہ ہے کہ ولی اور اس کے معاصرین کا کلام ان کے پیشروؤں کی نسبت زیادہ صاف، سہل، مترنم اور سجل ہے —— اشعار میں روانی اور بے تکلفی ہے۔ بعض شعر تو اسقدر صاف ہیں جیسے موجودہ دور میں لکھے گئے ہوں۔

ولی اس پورے دکنی دور کے گل سرسبد ہیں۔ ولی کے دیوان میں غزل، قطعہ اور رباعی وغیرہ کے سوا قصائد کی تعداد پانچ ہے اور وہ سب حمد و نعت یا منقبت و مدح میں کہے گئے ہیں —— مدح میں وہی خیالات و مضامین، موزوں کیے گئے ہیں جنہیں فارسی شعرا "التزاماً" کہا کرتے ہیں۔ بعض الفاظ مخصوص دکنی ہیں جن کا استعمال ہند کے دوسرے صوبوں میں نہیں۔

نمونہ:- قصیدہ در حمد و نعت و منقبت و موعظت۔ کل اشعار ۱۲۳

ہے زباں پر تو اول اول نام پاک خدائے عزوجل

لائق مدح نہیں ہے اس بن اور اس اُپر متفق ہیں اہل ملل

آسماں اور زمیں کے سب ساکن　　یاد کرتے ہیں اس کو ہر پل پل
شکر اس کا محیط اعظم ہے　　وہ ہے سلطان بارگاہِ ازل
بعد حمد خدا اے بے ہمتا!　　یاد کر نعت سیدِ مرسل
جس کی ہمت کی ہے ترازو میں　　دو جہاں مثل دانۂ خردل
اس کی محفل میں آ ہوا ہے کھڑا　　صف آخر ہیں جو ہے اول
گر ہو وہ آفتاب گرم عتاب　　آسماں جائے مثل موم پگھل
کاملاں سے سنا ہے یہ نکتہ　　عشق اس کا ہے ہادیِ اکمل
بعد اس آفتاب انور کے　　چار ہیں اہل علم و اہل عمل
صاحب صدق و عدل و علم حیا　　ایک سوں ایک اکمل و افضل
ختم خلفا کی کیا کہوں میں بات　　جس کے رتبے کا عرش پر ہے محل
جب ہوا وہ سوار دُلدل پر　　فوج پر فوج دل پہ مارا دل!
وہ ہے یکتائے دیں کہ جن نے کیا　　لاکھ مشکل کو ایک پل میں حل
نام اس کا کہ جس کے تقرے سے　　زور نے زور بل نے مارا بل
ہے علی وہ کہ جس کی دہشت سے　　جی گیا دشمنوں کا تن سے نکل
ہیں یہ چاروں ستون شرع متیں　　دین کا ان سے ہے مستقیم محل
مشرق و مغرب و جنوب و شمال　　سب کو ان چار ذات سے ہے بل
ہیں یہ اسلام کے صحیفے پر　　چار اطراف صورت جدول
بعد ان کے ہیں دو امام جہاں　　نورِ چشم پیمبرِ مرسل
ہر دو سلطان کشور کونین　　ہر دو مقبول شاہ روز ازل
ایک کا تن ہوا اطلس سبز　　ایک خوں سے زمیں کیا مخمل
گل دیا کو زیب تاج نہ کر　　یہ ہے سرپا تلک محیل و دغل

اس سے ہرگز نہ باندھ جی اپنا — کہ مبادا ہو دین بیچ خلل
ایک گھر میں رہے نہ پنجلی یہ — طالب یار تو ہے یہ چنچل
یہ ہے پالغرطامعان و حریص — اکثر اس دیکھ کر گئے ہیں پھسل
ترک کر سب کو بات میری سن — حرف شیریں ہے یہ زشیر و عسل
مرتبہ بوجھ عشق بازوں کا — یہ ہیں ملک وفا کے اہل دول
اے ولی یہ قصیدۂ رنگین — جگ میں رکھتا نہیں نظیر و بدل
گوش حاسد میں جب پڑے یہ شعر — راکھ ہو جائے رشک سے جل جل

ولی اورنگ آبادی کے ہمعصروں میں عاصی بھی ہیں۔ عاصی نے نصیر الدولہ کی مدح میں ایک ایسا عمدہ قصیدہ لکھا کہ داروغۂ قلمدان بنائے گئے۔ جب نصر الدولہ فوت ہو گئے تو عاصی برہان پور سے آصف جاہ کے یہاں اورنگ آباد چلے آئے۔ پھر حیدرآباد گئے اور یہیں ۱۱۷۰ھ میں وفات پائی۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مشتاق سے لے کر ولی اور عاصی تک جنہوں نے قصیدے کہے ان میں ایسی کوئی جدت یا ندرت نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے ہم انہیں ادبی اور فنی لحاظ سے کوئی بڑا درجہ دینے پر مجبور ہوں — اس وقت تک اردو قصیدے کی روح بیدار نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی وہ فارسی قصیدہ کے مقابل ہوا تھا —— اور اس کی وجہ یہ کہ اس وقت اردو زبان اپنے شباب پر نہیں پہنچی تھی۔

شمالی ہند

ولی وغیرہ کے بعد ادبی سرمایہ جنوبی ہند سے شمالی ہند میں منتقل ہوتا ہے شمالی ہند میں حاتم و آرزو کے دور میں قصیدے نے کوئی ترقی نہیں کی۔ البتہ میر و مرزا کے دور میں اور ان کے بعد بھی بہت سی ہستیوں نے کم و بیش

قصیدے کہے ہیں جو ان کے دیوانوں میں موجود ہیں —— یہاں جن قصیدہ گو شعرا نے قصیدہ گوئی میں امتیاز پایا وہ حسب ذیل ہیں:-

سوؔدا (اکتالیس قصیدے) میرؔ (پانچ قصیدے) غالبؔ (تین قصیدے) انشاؔ (دس قصیدے) مومنؔ (نو قصائد) ذوقؔ (اٹھائیس قصیدے) اس کے بعد متاخرین کا دور آتا ہے اس دور میں قصیدہ گوئی میں حسب ذیل شعرا کامیاب رہے ہیں۔

امان علی سحرؔ (دس قصیدے) سید اسمٰعیل منیرؔ شکوہ آبادی (اٹھائیس قصیدے) تسلیمؔ (قصائد کی تعداد کافی ہے) قدرؔ بلگرامی (سات قصیدے) محسنؔ کاکوروی (چار قصیدے) داغؔ دہلوی (چھ قصیدے، امیرؔ مینائی (سات قصیدے) حالیؔ (دو چار قصیدے)

سودا (آبحیات کے مطابق ولادت ۱۱۲۵ھ / ۱۷۱۳ء) مرزا سودا اپنے دور کے جلیل القدر اساتذہ میں سے تھے —— اُردو قصیدہ نگاری میں ان کا مرتبہ بہت ہی بلند ہے اور انہیں اُردو قصیدہ گوئی میں وہی حیثیت حاصل ہے جو فارسی قصیدہ گوئی میں انوری وخاقانی وغیرہ کی ہے —— سوداؔ اُردو قصیدے کے بادشاہ ہیں اور ان کا دور قصیدے کے شباب کا دور ہے۔ سودا سے پہلے اُردو قصیدے میں اتنی جان نہیں پڑی تھی کہ وہ فارسی کے بہترین قصیدے کا مقابلہ کر سکتا۔ یہ سودا ہی تھے جنھوں نے اپنی فنی صلاحیتوں اور عرق ریزیوں سے قصیدے کو فن، مضامین تخیل اور زبان کے لحاظ سے اس قدر جلا بخشی کہ وہ فارسی کے اعلیٰ قصیدے سے کسی طور پیچھے نہ رہا۔

وہ خود بھی اپنے آپ کو فارسی شعرا سے کم نہیں سمجھتے، کہتے ہیں۔

انوری سعدی وخاقانی مداح تیرا
رتبہ شعر وسخن میں ہیں بہم چاروں ایک

سوداؔ کی طبیعت میں ایجاد و اختراع کی خاص استعداد و قابلیت تھی۔ انہوں نے اکثر مروجہ اصناف میں تبدیلیاں کر کے، انہیں کشادگی بخشی۔ خاص طور سے مرثیہ و قصیدہ میں تو ان کی اصطلاحات نمایاں ہیں۔ ان کی طبیعت ہجو کی طرف بھی مائل تھی —— انہوں نے غزلیں بھی بہترین کہی ہیں جن میں تاثیر کی کمی نہیں —— لیکن جو مرتبہ انہیں قصیدے گوئی میں حاصل ہوا وہ کسی دوسری صنف میں حاصل نہ ہو سکا۔

سوداؔ کا مشاہدہ زندگی وسیع تھا۔ اور ان کی شاعری میں خارجیت و داخلیت کی خوشگوار و حسین آمیزش ہے۔

سوداؔ نے اپنے قصیدوں میں چاروں ارکان کا بہت ہی احترام کیا ہے اور انہیں وہ بے پایاں رعنائیاں بخشی ہیں کہ "ابدی شہرت" کے حامل ہو کر گئے ہیں سوداؔ کی تشبیب زور بیان اور جدّت سے ہمکنار رہتی ہے۔ اور گریز کا تو جواب ہی نہیں، اس چابک دستی اور صحت مندی کے ساتھ تمہید کو مدح سے ملاتے ہیں کہ طبیعت شگفتہ ہو جاتی ہے۔

ان کے قصیدے رعنائی بیان اور نزاکت خیال کے مرقعے ہیں۔ اور بعض تو عرفی و خاقانی کے قصیدوں کی یاد دلا دیتے ہیں۔

سوداؔ کے قصائد میں وہ تمام محاسن اور خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں جو فارسی قصیدہ کا طرۂ امتیاز تھیں —— مضمون آفرینی، حسن ادا، تخیل کی بے پناہ اڑان، بلند آہنگی، مبالغہ آرائی، الفاظ کی سج دھج، معجز بیانی، بہاؤ، شگفتگی، حلاوت، متانت پختگی، وصف نگاری، نکتہ آفرینی، دقیقہ سنجی، دلکش تراکیب، نئی تشبیہات، و تلمیحات، منزہ اشارے، سبھی کچھ ان کے قصیدوں میں دکھائی دیتا ہے۔

واقعہ نگاری میں بھی انہیں مہارت حاصل ہے۔ مثلاً روہیلوں کے مغلوب ہونے پر نواب شجاع الدولہ کو جو تہنیت کا قصیدہ پیش کیا تھا اس میں نواب

اور حافظ رحمت خان کی لڑائی کا حال بالتفصیل لکھا ہے اسی طرح انہوں نے اپنے قصیدے میں لوگوں کے مشاغل اور پیشوں کا تذکرہ بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔

مرزا کو قصیدہ گوئی کے فن میں مہارت تامہ حاصل ہے۔ بعض دفعہ تو اپنے قصیدوں کے لئے بڑی کٹھن اور سنگلاخ زمین اختیار کی ہے ——— اور بحیثہ کامیاب قصیدے کہے ہیں۔ مثلاً ان کا یہ قصیدہ:

نیر سے سائے تلے ہے تو وہ جنت
پشہ کر جائے بربود دسے لرزت

سودا کے قصیدے کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی جدت ہے۔ وہ اپنے معاصرین یا متقدمین کی طرح، بیان کردہ باتیں، بار بار کہنے کے خوگر نہیں ——— اور یہ ان کی جدت پسندی ہی کا تقاضہ ہے کہ وہ ہر چیز میں نیا پن چاہتے ہیں۔ اور نئی نئی تشبیہوں، تازہ استعاروں اور رواں تلمیحات سے اپنے قصیدے جانتے ہیں:۔

مثلاً ایک قصیدے کے یہ چند اشعار

زلفیں یوں رخ پہ کہ بکھری ہوئی مانگے بھیں لی
جس طرح ایک کھلونے پہ ہیں دو بالک
دونوں عارض گویا شیشے ہیں مرگلگوں کے
رُخ ان دونوں میں یوں جیسے نمکداں میں نمک
بات اس لطف سے بکے تھی دہن میں اس کے
بادہ جوں ساغر لبریز سے جاتا ہے چھلک

سودا کے قصیدوں میں معصومیت، انانیت، حلاوت، نمکینیت، سج دھج شادابی، دلکشی، داخلی خارجی کیفیتیں، رفعت، موسیقیت اور روانی، دلبرانگیاں اور

طرازیاں ہیں —— اور ان سب کی تخلیق، مرزا نے اپنے لہو سے کی ہے۔

سودا کے قصائد کی تعداد اکتالیس ہے جو نعت و منقبت کے علاوہ شاہ عالم، نسبت خاں خواجہ سرا، عالمگیر ثانی، احمد خان بنگش، مہربان خان، نواب شجاع الدولہ نواب وزیر الممالک، آصف الدولہ وغیرہ کی شان میں کہے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ چند قصیدے ہجو اور شکایت زمانہ کے متعلق بھی ہیں۔

نمونہ کلام (سودا)

قصیدہ در نعت حضرت محمد مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم)

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی

ہنر پیدا اگر اول ترک کیجو تب لباس اپنا
نہ ہو جوں تیغ بے جوہر وگرنہ ننگ عریانی

فراہم زر کا کرنا باعث اندوہ دل ہووے
نہیں کچھ جمع سے غنچے کو حاصل جز پریشانی

خوشامد کب کریں عالی طبیعت اہل دولت کی
نہ جھاڑے آستین کہکشاں شاہوں کی پیشانی

عروج دست ہمت کو نہیں ہے قدر بیش و کم
سدا خورشید کی جگ پر مساوی زر افشانی

کرے ہے کلفت ایام ضائع قدر مردوں کی
ہوئی جب تیغ زنگ آلودہ کم جاتی ہے پہچانی

اکیلا ہو کے رہ دنیا میں گر چاہے بہت جینا
ہوئی ہے فیض تنہائی سے عمر خضر طولانی

اذیت وصل میں دونی جدائی سے ہو عاشق کو
بہت رہتا ہے نالاں فصل گل میں مرغ بستانی

موقر جان ارباب ہنر کو بے لباسی میں
کہ ہو جوہر تیغ با جوہر اسے عزت ہے عریانی

برنگ کوہ رہ خاموش حرف ناسزا سن کر
کہ تا بد گو صدائے غیب سے کھینچے پشیمانی

یہ روشن ہے برنگ شمع ربط باد و آتش سے
موافق گر نہ ہووے دوست ہے وہ دشمن جانی

نہیں غیر از ہوا کوئی ترقی بخش آتش کا
نفس خنجک ہے داغ دل سے فرصت کیجیو پانی

کرے ہے دہر زینت ظالموں پر تیرہ روزی کو
کہ زیب ترک چشم یار سرمہ ہے صفاہانی

طلوع مہر ہو پامال حسرت آسماں اوپر
لکھوں گا پھر غزل گر اس زمیں میں مطلع ثانی ؛

عجب ناداں ہے جن کو ہے عجب تاج سلطانی
نہیں معلوم ان نے خاک میں کیا کیا ملا دیکھا
ہماری آہ دلِ تیرا نہ نرمائے تو یا قسمت
تری زلفوں سے اپنی رو سیاہی کہہ نہیں سکتا
زمانے میں نہیں کھلتا ہے کارِ بستہ حیراں ہوں
جنوں کے ہاتھ سے سر تا قدم کاہیدہ آتا ہوں
نہ کھا جگ میں رسم دوستی اندوہ روزی نے
سیہ بختی میں اے سودا نہیں طولِ امل لازم
بجھا اے تا قباحت فہم کنگنک یہ بیاں ہو گا
خدا کے واسطے باز آ تو اب ملنے سے خوباں کے
نظر رکھنے سے حاصل اُن کے چشم و زلف کے اوپر
نکال اس کفر کو دل سے کہ اب وہ وقت آیا ہے
زہے دینِ محمدی پیروی میں اس کے جو ہو دیں
ملک سجدہ نہ کرتے آدمِ خاکی کو گر اُس کی
اُسی کو آدم و حوا کی خلقت سے کیا پیدا
خیالِ خلق اس کا گر شفیع کافراں ہووے
زباں پر اپنے گزرے حرف جس جا گہ شفاعت کا
رکھا جب سے قدم مسند پہ آ اُن نے شریعت کا
اگر نقصان پرِ خس کے شرر کا ہمت ارادہ ہو
موافق گر نہ کرتا عدل اس کا آب و آتش کو
ہو کیا انصاف ہے یارو کہ طیر و وحش تک جگ میں

فلک بالِ ہما کو پل میں سونپے ہے مگس رانی
کہ چشمِ نقشِ پا سے تا عدم نکلی نہ حیرانی
وگرنہ دیکھ آئینے کو پتھر ہو گیا پانی
کہ ہے جمعیتِ خاطر مجھے ان کی پریشانی
گرہ غنچے کی کھولے ہے صبا کیونکر باسانی
کہ اعضا و بدن زنجیر کی کرتے ہیں عریانی
مگر زانو سے اب باقی رہا ہے ربطِ انسانی
غلط خامہ کے سر کٹوائے گی ایسی زباں دانی
ادائے چینِ پیشانی و لطفِ زلفِ طولانی
نہیں ہے ان سے ہرگز فائدہ غیر از پشیمانی
مگر بیمار ہو وے صعب یا کھینچے پریشانی
برہمن کو صنم کرتا ہے تکلیفِ مسلمانی
رہے خاکِ قدم سے اس کی چشمِ عرش نورانی
امانت دارِ نورِ احمدی ہوتی نہ پیشانی
مراد الفاظ سے معنی ہیں تا آیاتِ قرآنی
رکھیں بخشش کے سر منت یہودی اور نصرانی
کرے واں ناز آمرزش پہ ہر اک فاسق و زانی
کرے ہے موجِ بحرِ معدلت تب سے یہ طغیانی
گرہ کو آگ کے دو ہیں گرے ہے غرق آن کر پانی
تو کوئی سنگ سے بندھتی تھی شعلِ لعلِ رمانی
اس امن و عیش سے اپنی بسر اوقات ہے جانی

پلے ہے آشیاں میں باز کے، بچہ کبوتر کا
شباں نے گرگ کو گلے کی سونپی ہے نگہبانی

ہُما آسا ہے پرواز مرغ اوجِ سعادت پر
کرے ہے مور چڑھ کر سینۂ دو پر سلیمانی

کھلے ہے غنچۂ گل باغ میں خاطر سے بلبل کے
جواب اوراق جمعیت کو ہوتی ہے پریشانی

جہاں انصاف سے ہر گاہ اب معمور ہے اتنا
تو اسکے آگے ہوگی عدل کی کیا کچھ فراوانی

ہزار افسوس اے دل ہم نہ تھے اسوقت دنیا میں
وگرنہ کرتے یہ آنکھیں جمال اس کے سے نورانی

نہ چھٹنے سے جدا سائے کے اس قامت سے پیدا ہے
قیامت ہووے گا دلچسپ وہ محبوب سبحانی

جسے یہ صورت و سیرت کرامت حق نے کی ہووے
بجا ہے کہئے ایسے کو اگر اب یوسف ثانی

معاذ اللہ یہ کیا حرف بے موقع ہوا سرزد
جو اسکو پھر کہوں تو ہوں میں مردودِ مسلمانی

کدھر اب فہم ناقص لیگیا مجھ کو نہ یہ سمجھا
کہ وہ مہر الوہیت ہے یہ ہے ماہ کنعانی

جو صورت اسکی ہے لاریب وہ ہے صورت ایزد
جو معنی اس میں ہیں بیشک وہ ہیں معنی ربانی

حدیث من رآنی وال ہے اس گفتگو اوپر
کہ دیکھا جس نے اسکو ان نے دیکھی شکل یزدانی

غرض مشکل ہیں ہوتی کہ پیدا کرکے ایسے کو
خدا اگر یہ نہ فرماتا نہیں کوئی مرا ثانی

بس آگے مت چل اے سودا میں دیکھا فہم کو تیری
کر استغفار اس منہ سے اب ایسے کی ثناخوانی

قصیدہ در مدح نواب شجاع الدولہ لکھنؤ (کل اشعار ۵۰) مندرجہ ۲۵

مرغ معنی کے اگر صید پہ اپنا ہو خیال
عرش پرواز ہو تو کھل نہ سکیں اس کے بال

نہ پہنچے طائرِ مضمون نظر انداز مرا
فکر عالی کی ہے شاہین مری راہ زوال

آوے ہے شعر و سخن پر جو طبیعت میری
معنی پڑے سے عدم کے کریں ہیں استقبال

کچھ مجھے تازہ مضامین کی نہیں سعی و تلاش
پھرتے ہیں ناطقہ میرے کے سدا وہ دنبال

شستہ و شوخ ہوں میں الفاظ کو جس پائی ہے
ذرہ ہے آب گہر سامنے اس کے وہ زلال

نور خورشید ہو شب گھر سے فلک کے زائل
نور معنی سے مری بیت کے ہے دور زوال

جس زمیں پر میں کروں بیٹھ کے مصرع موزوں
واں مجسم ہو رہے روئیدگی نخل خیال

جو زباں داں متمتع ہوں زباں کا میری
پھر وہ ہونے کی فصیحی کو نہیں اس سے مجال

خامہ کہتا ہے مرا ہے جو فصاحت اک چیز
سو زباں کی ہے مری خادمۂ بے زر و مال

یہ زباں مجھ سے کی خامے کو عطا کرنے سے
میں سمجھتا ہوں جو بخشی ازل کا ہے مآل

کہہ رہے ہیں مدح میں ایسے کی جسے تا ابد
پرورش کرنے میں گزرے کہ دمہ کی وہ مالی

یعنی نواب فلک رتبہ شجاع الدولہ
قائم اس کا رہے تا حشر یونہی جاہ و جلال

مطلع تازہ کرے خامہ رقم اب ایسا
کہ برابر مطلع انوار کیا جائے خیال

پہ تمنا سے جبیں بدر بھی ہوتا ہے ہلال
بسکہ یاں سجدے کے مشتاق ہیں ارباب کمال

یہ وہ در ہے کہ یہاں آ کے سہم پہنچا دے
رتبہ بال ہما ہر مگس بے پر و بال

کہ ہر انساں پہ جو ہر ہے طبیعی تیرا
خواہ ہو نیک کوئی خواہ کوئی بد اعمال

قول پر ان کے نہ ہوتی تری ہمت جو دلیل
پوچھتا میں حکما سے ہے خلا کیوں کہ محال

جس گھڑی دہر میں تیرا ہو کف جود بلند
اور اسوقت کوئی تجھسے کرے آکے سوال

ہو یہ انبار طلا دست تلے سائل کے
کہ جیسے پنجۂ خورشید کا پہنچے نہ خیال

نطق نے نیں حرفوں سے ترے عہد کے بیچ
بین و واؤ و الف و لام کو ڈالا ہے نکال

تیرے شبرنگ کے جلوے کے نقش جب دیکھے
کہے وہ اس کو کنہیا زرہ حسن و جمال

تیرے ہاتھی کا بیاں تجھ سے کروں میں لیکن
چھوٹا منہ اور بڑی بات نہیں اس کا قال

اس طرح مشک زنگیں پہ ہے اس کی کجباگ
جو فلک پر شفق شام میں نکلے ہے ہلال

تو جو ہے مہر جہاں تاب بذرات جہاں
مہر کو ذرے سے تشبیہہ ہے تحقیق پہ دال

ختم کرتا ہے دعائیہ پہ سودا یہ کلام
دوست ہوں شاد ترے اور ہوں دشمن پامال

سودا کے ساتھ ساتھ میر تقی میر بھی اردو شعر و شاعری میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ اور بڑے بڑے شاعروں نے ان کا احترام کیا ہے۔ میر غزل کے بادشاہ ہیں

انہوں نے غزلوں، مثنویوں اور مرثیوں کے علاوہ قصیدے بھی لکھے ہیں قصیدہ نگاری میں میر کوئی مقام حاصل نہ کر سکے۔ ان کا اصل کمال تو غزلوں میں اُبھر کر ہوتا ہے!

قصیدہ، مضامین میں چونچلاپن، شگفتگی، الفاظ میں شان و بلندی، خیال میں غلو اور جدت چاہتا ہے ــــ میر قانع، پژمردہ اور سادگی پسند تھے۔ مبالغہ اور تصنع سے انہیں لگاؤ نہ تھا اور اسی لئے وہ قصیدہ میں ابھر نہ سکے۔ ان کی شاعری کا اہم جُزو درد و درماندگی ہے۔

میر نے صرف پانچ قصیدے لکھے ہیں جن میں چار منقبت میں ہیں اور ایک نواب آصف الدولہ کی شان میں ہے۔ میر کے یہاں تشبیب میں کوئی اٹھان نہیں گریز بھی فن کے لحاظ سے پست ہے۔ قصیدے طویل نہیں اور نہ ہی ان میں قصیدوں کی آن بان، بندش کی چستی، بیان کی روانی اور مضامین کی بلند پروازی ہے۔ زبان و بیان میں غزل کا سا انداز ہے۔

نمونہ کلام (میر) منقبت حضرت علی مرتضیٰ

اب کج روش تو نامہ نہ لکھ بھیج مت پیام
قاصد کا میرے سیدھی طرح سے تو لے سلام
دل میں نہیں ہے قطرہ خوں آنکھیں ہیں گی تر!
خالی پڑا ہے شیشہ مے بھر رہے ہیں جام
ناکامیوں سے کام رکھا ہیں تمام عمر!
گو کام دل حصول نہ ہو مجھ کو کیا ہے کام
صیاد نے اسیر کیا مجھکو پر عبث
میں ٹک جیا نہ فرط تپیدن سے زیر بام

اے طبع ہرزہ سرائی جرس کی طرح
اتنی اس گفتگو سے فائدہ، کہہ حاصل کلام

سوداؔ کے بعد دوسرے بڑے قصیدہ گو میر انشاؔ اللہ خاں انشاؔ ہیں۔ ان کے قصائد سوداؔ کے بعد اپنی ہمہ ہمہ زائیوں، الفاظ کی آن بان اور تراکیب کی شکوہ میں بے نظیر ہیں۔ میر انشاؔ چنچل وش طبیعت کے مالک تھے اور مزاج میں شگفتگی اور شوخی تھی —— اور یہ باتیں قصیدے کے حق میں جاتی ہیں۔ اور اسی لئے انہیں اس فن سے خاص لگاؤ تھا۔ بقول "آزاد" ان کے قصیدے بڑی دھوم دھام کے ہیں" میر انشاؔ کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ انہوں نے عربی، فارسی۔ اُردو، پشتو، پنجابی اور پوربی زبانوں میں شعر کہے ہیں —— اور کئی قصیدے تو ایسے ہیں جن میں عربی، فارسی، ترکی اور ہندی بھاشا کے اشعار بھی شامل کر دیئے ہیں۔

انشاؔ نے اپنی ذہانت اور صلاحیت سے نئے اسالیب پیدا کئے ہیں۔ اور اپنے عام قصیدوں کا تو ذکر ہی کیا اپنے طویل ترین قصیدے میں بھی روانی، شگفتگی، اور جوش بیان میں کمی نہیں آنے دی ہے —— انشاؔ کو زبان پر عبور حاصل ہے —— ان کے بیان تشبیہیں زور دار ہیں۔ خیالات میں جدت اور تخیل میں ندرت ہے —— زبان زور دار اور پر لطف ہے۔

انشاؔ نے شہزادہ سلیمان شکوہ کی شان میں جو قصیدہ کہا ہے وہ ایک سو پانچ شعروں پر مشتمل ہے اس میں انہوں نے اپنی فنی بصیرت اور استعداد سے عمدہ مضامین پیدا کئے ہیں —— اور عجیب عجیب قسم کے قافیئے تخلیق کئے ہیں۔ اس قصیدے کے کچھ اشعار دیکھئے!

صبح دم میں نے جو لی بستر گل پر کروٹ
جنبش باد بہاری سے گئی آنکھ اچٹ

دیکھتا کیا ہوں سرہانے ہے کھڑی ایک پری
جس کے جوبن سے ٹپکتی ہے نری گدرا، اہٹ

آفتاب اس کی جبیں کے جو مقابل ہووے
صدقے صد قسم ہو کے اُف رہی تری چمکاہٹ

موتیوں سے جو بھری مانگ وہ دیکھے اس کی
بیر سے تاروں بھری رات کی جی جائے ہٹ

حرکت اس کی تھی یوں غمزۂ چالاک کے ساتھ
رند جوں اینڈ کے مے خانے میں لیویں کروٹ

شوخی اس رُو سے اُس تار نظر میں کھیلے
آتا جاتا ہو رسن پر کوئی جس طرح سے نٹ

قامت ایسی کہ قیامت بھی کرے جس کو سلام
اس کے اٹھلاتے ہوئے چلنے کی سنکر آہٹ

شور محشر کو یہ کہہ بیٹھے خرام اس کا صاف
دال ف عین ا بے دور پرے ہو چل ہٹ

نشہ میں قلقل مینا سے یہ فرما اُٹھے
کیا خوش آتی ہے صدا مجکو یہ تیری غٹ غٹ

سرو و شمشاد و صنوبر سے کہے چلتے ہو!
کھیلنے جاتے ہیں ہم آج چمن میں جھرمٹ

کچھ نہ گہنا نہ جواہر نہ تکلف نہ بناؤ
سادگی اپنی سے مسرور خوشی سے غٹ پٹ

الغرض تھی جو ان اوصاف سے موصوف اس نے
اپنے مکھڑے سے دوپٹے کے مسلسل کو الٹ

مجھ سے سرمکھ ہو کہا دولت بیدار ہوں میں
خواب غفلت سے بس اب چونک لگے میرے لپٹ

مجلس آراستہ ہے سال گرہ کی اُس کی
جس کی ہر لحظہ دعا دینے میں ہے سب کو رٹ

یعنی وہ شاہ سلیماں کر شکوہ اُس کے لیے
نیر حشمت و اقبال کو ہے چمکاہٹ

جشن شاہانہ ہے اور ہیں امرا حاضر وقت
اسکے مجرے کو کھڑے فوجوں کے ہیں غٹ کے غٹ

بزم ایسی ہی مرتب ہے کہ سبحان اللہ
جس میں اقسام تماشا کا ہوا ہے جمگھٹ

واسطے نذر کے کر تو بھی قصیدہ کوئی عرض
اُٹھ کمر باندھ ابھی جلد چلا چل جھٹ پٹ

سنتے ہی میں سنے یہ دولت سے خوشی کا مژدہ
شرف اندوز ہوا خدمت اقدس میں جھٹ

بارہا محفل شاہانہ میں مطلع وہ پڑھا
جس کی سطوت سے ہوئی جان عدو کی تلپٹ

عازم جنگ ہو جس لحظہ تو گلگوں کو ڈپٹ
گاؤ سر پھینک کے چٹ سام سا بھاگے چھوٹ

ختم کرتا ہے دعا پہ یہ انشاء اللہ
یارب اس در پہ ہو عالم کی خوشی کی آہٹ

صحت جشن و نشاط و طرب و دولت کا
حسب دلخواہ رہے ذات سے تیری جمگھٹ

خوبی و خرمی و راحت و آرام و سرور — تیرے دروازے کی تا حشر نہ چھوڑیں چوکھٹ

انشاؔ نے فارسی قصیدوں کے علاوہ اردو زبان میں دس قصیدے لکھے ہیں جو حمد و نعت کے سوا بادشاہ عالی گہر، شہزادہ سلیمان شکوہ (پسر شاہ عالم) نواب سعادت علیخاں اور دولہن بیگم کی ستائش میں ہیں۔ ان قصیدوں کے علاوہ انہوں نے ایک طویل ترین قصیدہ (۱۵۵ اشعار) انگلستان کے بادشاہ جارج سوم کی سالگرہ کے موقع پر کہا ہے جس میں زبان کی معجز بیانیاں، کیف میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اور فکر کی اونچی اڑان، ساون بھادوں کی قوس دکھائی دیتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ اس قصیدہ میں ایک غلام ذہن کام کر رہا ہے اور یہیں غلامی کے دور کا احساس دلا رہا ہے۔

(نمونۂ کلام انشاؔ)

(قصیدہ در سالگرہ جارج سوم بادشاہ انگلستان)

بگھیاں نور کی تیار کر اے بوئے سمن — کہ ہوا کھانے کو نکلیں گے جوانانِ چمن
عالم اطفالِ نباتات پہ ہوگا کچھ اور — گورے کالے سبھی بیٹھیں گے نئے کپڑے پہن
کوئی شبنم سے چھڑک بالوں پہ اپنے پوڈر — بیٹھ کر جلوہ کرسی پہ دکھاوے گا پھبن
نسترن بھی نئی صورت کا دکھاوے گا رنگ — کوچ پہ نازک سے جب پاؤں رکھیگا بن ٹھن
اپنے گیلاس شگوفے بھی کریں گے حاضر — غنچۂ گل سبھی واں کھولیں گے بوتل کے دہن
سبھی مل مل کے بجاویں گے فرنگی تنبور — لالہ لاوے گا سلامی کو بنا کر پلٹن
کھینچ کر تارِ رگِ ابرِ بہاری سے کئی — خود نسیمِ سحر آوے گی بجانے ارگن
اپنی سنگینیں چمکتی ہوئی دکھلاویں گی؟ — آپڑے گی جو کہیں نہر پہ سورج کی کرن
نے نوازی کے لئے کھول کے اپنی منقار — آ کے دکھلاوے گی بلبل بھی جب اسکا فن
نکہت آوے گی نکل کھول کلی کا کمرہ — ساتھ ہولیگی نزاکت بھی جو ہے اس کی بہن
جب ہوا کھا کے گھر آئیں گے تو دیکھیں گے ناچ — وضع پہ ہند کے ہے باغ میں جس کا مسکن

کیا تعجب ہے جو فواروں کی ہو سازنگی
ہیں جو ان خوبیوں کیا تھ وہ ناچیں گے آج
آج ہے جون مہینے کی یہ چوتھی تاریخ
اس میں ہے سالگرہ اُس کی جسے کہتے ہیں
کچھ نہ لندن ہی میں یہ زمزمہ عیش ہے آج
یہ خبر سن کے ہوا شاد وہ فخر آفاق
یعنی نواب فلک رتبہ یمین الدولہ
ناظم الملک بہادر وہ جناب عالی؛
وہ سعادت علی خاں عالی اعلیٰ جس سے
کس نے اس شان کا دیکھا ہے وزیر اعظم
اس خوشی کا یہ سبب ہے کہ سب انگریز کے راز
اور انگریز پہ بھی ہیں جو وہ اسرار حضور
جب بہم رابطے یہ ہوں تو نہ ہووے کیونکر
کیونکہ مالک ہے سب انگریز کا وہ شاہ بزرگ
وصف میں اس کے سنو مطلع رنگیں اک اور
اسکے یوں فرق پہ ہے تاج مرصع کی پھبن
قدر ہر علم کی کی اس نے یہاں تک کہ بہم
اس کی افواج نے ہا کی دو قیصر روم
قوم نے اس کی جو دوڑائے سمندر میں جہاز
جستجو دیکھ نئی اور نکالی دنیا
قوم انگریز یہ ہے ایسی کہ جن سے کانپے

زور کے طبل بجیں ایسے کہ ہوں مست ہرن
اس میں گر شک ہو تو پھر سن لے تو اے بتِ سمن
کیوں نہ اس روز مبارک کی انوکھی ہو پھبن
جارج ثالث وجم مرتبہ شاہ لندن
ہند میں بھی تو ہر اک گھر میں ہے جلسے کی پرن
جس کے مقدم کا سبب سے ہے یہ جہاں رشک چمن
حاتم عہد و جم وقت فلاطون زمن
دب گئے جس سے زمانے کے سب آشوب و فتن
جس کے ہے بخت اقبال سے عالم گلشن
جس کے گھر ہووے سلاطین کا متفقہ مامن
اس فلک دید پہ سب آئینہ ساں ہیں روشن
پرتو انداز ہیں جوں آب میں سورج کی کرن
اس ہما پایہ کا دل گنج طرب کا مخزن
جس کا جارج لقب اور بندہ ہے سلطان ختن
روپ سے جسکے ہو شرمندہ بہار گلشن؛
صبح کو جیسے نمودار ہو سورج کی کرن
سینکڑوں جمع ہوئے فضل و ہنر کے خرمن
مصر کے ملک سے سب مار نکالے دشمن
وہ کیا کام سکندر سے نہ جو آیا بن
رائج اس میں کئے اپنے ہی جیسے تھے چلن
آوے گر فوج عفاریت سمٹ آہرمن

کیوں نہ اس قوم سے ظاہر ہو شجاعت ایسی | ان کے ہے سر پہ وہی مہر لقا سایہ فگن
دل میں ہے کر کے مخاطب اسے اک مطلع تو | پڑھیے ایسا ہی کہ غش سن کے کریں اہل سخن
بیٹھے جب تخت پہ تو وہ وقت سخاوت بن ٹھن | مورچھل ہاتھ میں لے کر ہو کھڑا راجہ کرن
ہو سکے وصف تری کرچ کا کس سے پورا | ہے نمونہ اسی کا مہر درخشاں کی کرن !
علم گر تیرے زمانے میں نہ ہوتا نہ ایجّ ! | اور ترا ملک نہ ہوتا علما کا مامن
بسکہ تمیز کسی فن کی نہ رہتی باقی | بو علی بیٹھتے بن کر سبھی گنگ و الکن
تھے ریاضی میں جو ماہر حکمائے یونان | تھے بجاتے سبھی وہ نقارۂ الملک لمن
پھر ترے عہد میں موجود جو ہوتے تو انہیں | ایک لڑکا بھی کہتا کہ پرے ہو کودن
ہو گئیں تصنیف کتابیں جو ترے عہد میں ہیں | ان کے آگے کتب اضحیہ تقویم کہن !
سامنے ان کے ہے تحریر مجسطی ایسی ! | جس طرح ہووے نئی جنس کا میلا بھیٹن ،
اب دعائیہ پڑھ انشا کہو انشاء اللہ | مل کے آمیں کرو آمین سب اے اہل سخن
جب تلک شاہ کے گھوڑے کی فلک ہو گجّی | جب تلک شام کے ہو ساتھ شفق کی پلٹن ،
جب تلک چرخ کہن شکل گورنر میں رہے | صاحب شرق ہیں جب تک کہ ہوں جنرل کے چلن
شاہ انگلس بھی جارج رہے با ظلم و شکوہ | سبکو بخشا کرے نت سیم و طلا لاکھوں من
کمپنی نور کی جب تلک کہ رہے یہ قائم | بادشاہی رہے اس کی ہی بوجہ احسن
ناظم الملک بہادر سے اور انگریزوں سے | رابطے یوں ہی رہیں اور محبت کی چلن
دونوں سرکاروں کا اقبال رہے روز افزوں | دوست سب شاد ہوں پامال رہیں سب دشمن

انشاء کے جن ہمعصر قصیدہ گو شعرا کی تعریف تذکروں میں ملتی ہے ، ان کا کلام موجود نہیں ، اس لئے ہم ان کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے ۔

انشاء کے بعد مشہور اور باکمال قصیدہ نگار ذوق ہیں

شیخ ابراہیم ذوق ۲۳ اگست ۱۷۹۰ء میں دلّی میں پیدا ہوئے ۔ ذوق

موسیقی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔ قصائد میں وہ اپنے معاصرین پر سبقت لے گئے ہیں اور استاد مانے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان کے بہت سے قصیدے ضائع ہو گئے ہیں۔ جو موجود ہیں ان سے ان کی اُستادی اور قادر الکلامی اور روانی کلام کا ثبوت ملتا ہے ——— ذوق کو انیس سال کی ہی عمر میں یہ قدرت حاصل ہوگئی کہ لوگ انہیں اُستاد کہنے لگے ——— اسی عمر میں ایک قصیدہ (جواب ناپید ہے) اکبر شاہ ثانی کی مدح میں پڑھا جس کا مطلع یہ ہے۔

جب کہ سرطان واسد مہر کا ٹھہرا مسکن
آب د ابلولہ ہوئے نشوونمائے گلشن

اس پر بادشاہ نے انہیں "خاقانی ہند" کے خطاب سے نوازا۔ جب ولیعہدی کے زمانے میں بہادر شاہ ظفر نے بیماری کی صعوبتوں کے بعد شفا پائی تو ذوق نے اپنا یہ مشہور قصیدہ خدمت میں پیش کیا۔ جس کے مع مطلع چند شعر یہ ہیں۔

واہ واہ کیا معتدل ہے باغ عالم میں ہوا
مثل نبض صاحب صحت ہے ہر موج صبا
بھرتی ہے کیا کیا میسحائی کا دم باد بہار
بن گیا گلزار عالم رشک صد دارالشفا
ہے گلوں کے حق میں شبنم مرہم زخم جگر
شاخ بشکستہ کو ہے باراں کا قطرہ مومیا
اس قدر جاتی رہی عالم سے بیماری کہ آج
نام گلشن میں نہیں ہے نرگس بیمار کا
واقعی کس طرح سے صحت نہ اک عالم کو ہو
جبکہ ہو اس کی نوید غسل صحت جانفزا

وہ ولی عہدِ زماں مرزا محمد بو ظفر
اس کی قوت گر ضعیفوں کو بنا دے اقویا
شادیٔ صحت سے اس کی آج ہو کر شاد شاد
تہنیت خوانی میں ہیں سرگرم سب مدحت سرا

اس قصیدہ پر ذوقؔ کو بہادر کا خطاب ملا۔ ــــ اور خلعت کے ساتھ ایک ہاتھی مع چاندی کے ہودہ کے عطا ہوا ــــ جب ظفر بادشاہ ہوئے تو یہ قصیدہ تہنیت میں پڑھا ــــ

روشن ہو تب کہ رُخ سے کیا نور سحر رنگ شفق
ہے ذرّہ نیر پر تو انوار سحر رنگ شفق

ذوقؔ نے ایک بہترین اور بیحد کامیاب قصیدہ لکھا جس پر انہیں ایک پورا گاؤں جاگیر میں عطا ہوا۔ اس کا مطلع یہ ہے۔

شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت
نشۂ علم میں سرمستِ غرور و نخوت

غرضیکہ، اسی طرح بار بار موقعوں پر ذوقؔ نے عمدہ اور بہترین قصیدے لکھے اور انعامات پائے۔ ان کا یہ قصیدہ جو انہوں نے بہادر شاہ کے غسل صحت پر ۱۸۵۱ء میں گزارا اپنی فنی خصوصیات سے آراستہ ہے۔ اس میں سو اشعار ہیں۔ اور اچھے قصیدوں میں شمار ہوتا ہے۔

زہے نشاط اگر کیجئے اسے تحریر
عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ ہائے صریر

ذوقؔ کے قصائد سے ہمیں ان کے حسن ذوق، ان کی قادر الکلامی، ان کے فکر کی بلند پروازی اور تازگی مضامین کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے کلام میں روانی اور

ترنم ہے۔ برمحل اور موزوں تشبیہات و تلمیحات ہیں۔ سلاست، فصاحت، شائستگی موزونیت، بلند آہنگی، حسن و جمال، اصطلاحات و استعارات، الفاظ کی شوکت اور زبان کا رکھ رکھاؤ اور بھرم ان کے قصائد کے حصّہ میں آیا ہے۔ ذوق کے یہاں فن قصیدہ گوئی عروج پر ہے۔

اُردو قصیدہ گوئی میں میرزا سودا کے بعد خاقانی ہند (ذوقؔ) کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ ان کے مجموعہ کلام میں ۲۳ تمام و ناتمام قصیدے ہیں۔ اور ایک کے علاوہ سب کے سب اکبر شاہ ثانی اور ابو ظفر بہادر شاہ کی مدح و ستائش میں کہے گئے ہیں:۔

دِلی سے انہیں بڑا پیار تھا۔ یہ شعر انہیں کا تو ہے:۔

آج کل گرچہ دکن میں ہے بڑی قدر سخن
کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

ذوقؔ نے ۱۸۵۴ء میں نومبر کے سولھویں روز (جمعرات) وفات پائی

نمونہ کلام (ذوق)

قصیدہ در مدح ابو ظفر بہادر شاہ در جشن سالگرہ کل اشعار ۵۸ (مندرجہ ۱۷)

جذا ساقی فرخ رخ و خورشید جمال — مرحبا مطرب ہاروت فن و زہرہ خصال
بارک اللہ کہ دُر افشاں ہے تو اے ابر بہار — خیر مقدم کہ خراماں ہے تو اے باد شمال
للہ الحمد لبالب ہے مئے عیش سے جام — شکر اللہ زر گل سے ہے چمن مالا مال
جوش روئیدگی سبزہ سے ہو جائیگا سبز — گل زمین چمن حسن میں تا دانۂ خال
اللہ اللہ رہی سرسبزی گلزار جہاں — کیا عجب ہو روش خضر اگر رنگ ہلال
ثمر تیشہ فرہاد سے پیدا ہوئے گل — بل پہ جوش گل خود روسر دامان خیال
جوش فوارہ ہے واں کثرت تار بارش — سر مجنوں کے تھے آلودہ جہاں گرد سے بال

کیا عجب رحمت باری ہے کہ وقت باراں
ابر مردہ سے بھی ہو قطرہ فشاں آب زلال

معجزہ باد سے مانند عصائے موسیٰ
شجر خشک بھی ہو جائے تر و تازہ نہال

ذوق مستی سے ہے طاؤس چمن میں رقاص
شوق آہنگ سے ہے سرو پہ قمری قوال

شور بلبل بھی یہ رکھتا ہے نمک آج کہ گل
بن گیا کثرت شبنم سے نمکداں کی مثال

دیتی ہے طاقت پرواز یہ کیفیت سے
اس ہوا میں ہے بط مے کہ اڑوں بے پر و بال

ہے یہ وہ دور کہ ہر صوفی صافی مشرب
رقص مستاں میں ہے وجد کناں شمال حال

پتلیاں ناچتی ہیں چشم کے گھر میں بے ساز
جنبش دست مژہ دے ہے اس انداز سے تال

ہو قلم ہاتھ اگر کوئی لکھے خط غبار
صفحۂ دہر پہ کیا دخل جو ہو گرد ملال

روز جشن آج ہے اس کا کہ جسے کہتی ہے خلق
نائب خاتم رسل ظل خدائے متعال

وہ بہادر شہ غازی کہ اگر تیغ اس کی
اپنی دکھلائے چمک چرخ پہ کٹ جائے ہلال

قصیدہ در مدح اکبر شاہ ثانی

خضر نصیب کی گر، دنیا میں رہبری ہو
اور شاہ راہ دل پر چشم ہنر وری ہو

منظور ہر نظر میں تب شکل آئنہ ہو دل
روشن قلم سے میرے تاج سکندری ہو

تارے کی طرح چمکے ذرہ مرے سخن کا
اور نام میرا روشن جوں مہر و مشتری ہو

ہیں رستم معانی اور سیستاں سخن ہے
دیتا جو زور قسمت دل کو تناوری ہو

برگشتہ بخت اپنا گر آئے راستی پر
گردوں بھی سرنگوں پھر دیکھ اپنی سروری ہو

یہ کہہ رہا تھا میں جو اک بار عقل بولی
وہ بات کہہ کہ جس میں میری بھی دلبری ہو

تجھ کو خبر نہیں کیا ہے، دور شاہ اکبر
رفعت سے پست جس کی شان سکندری ہو

ہے فکر کیا جب ایسا فیاض ہو جہاں میں
اور دل کا اس کے مقصد خود بندہ پروری ہو

مثل سحاب جا کر باندھے ہوا فلک پر
جس پر کہ اس کی چشم الطاف سرسری ہو

دربار میں تو اس کے ہو بہرہ یاب جاکر — بہروز ہی ہووے میری اور تیری بہتری ہو
لیکن یہ رسائی اُس وقت ہوگی روشن — جب خضرِ راہ تیری، طبعِ سخنوری ہو
تو بھی تو سوچ دل میں تیرے دُرِ سخن کا — اُس کے سوا جہاں میں کون آج جوہری ہو
اُس کی نظر چڑھیں گر یہ آبدار گوہر — پھر نام تیرا روشن مانندِ انوری ہو
تب بحرِ فکر میں دل غوّاص ہو کے اترا — معلوم ہو تا کہ سب کو زورِ شناوری ہو
مطلع یہ ہاتھ آیا شہوارین کے موتی — شرمندہ جس کے آگے صد کانِ جوہری ہو

شاہا نظر کرم کی جس ذرّے پر ذری ہو
وہ آسماں پہ جاکر خورشید خاوری ہو

دیکھی ہے چین ابروآئینہ جبیں میں — کیونکر نہ تن میں اُس کے ہیبت سے تھرتھری ہو
کیا تاب ہے فلک کی جنبش کرے جگہ سے — گر پھر جائے بندی ایسا ہو سرسری ہو
یہ آستانِ دولت ہے سجدہ گاہ عالم — دل کو تری عقیدت اور نجب پروری ہو
دارا کو تیرے در تک ہو کس طرح رسائی — درباں جو تیرے در کا، کرتا سکندری ہو
سورج مکھی کا تیرے اک پھول مہرِ انور — قربانِ چترِ دولت، نہ چرخ چنبری ہو
باغِ جہاں میں نرگس ہے کیوں نہ جامِ زریں — جب ہر گدا کو دیتا اک ساغرِ زری ہو
دکھلاتے آبداری جب تیغِ شعلہ دم کی — شیروں کے دل میں ٹھنڈا اخگرِ دلاوری ہو
کشتِ امل کو سرسبز آب گہر سے کردے — ابرِ کرم کی تیرے جب فیض گستری ہو
بیٹھے ہیں معدلت کے، وہ شیر ہے تو شاہا — نوشیرواں کو جس سے ہرگز نہ ہمسری ہو
شیوہ جو تو سوں کا۔ مہر کرم ہیں تیرے — تیری گداگری ہو، کیوں کیمیا گری ہو
گر آفتاب تیر ڈالے کرن کر اپنی؟ — تاجِ گدا کا جلوہ، جوں تاجِ قیصری ہو
تیری ثنا میں شاہا، لکھتا ہوں اب وہ مطلع — جس کی چمک سے کاغذ جوں کاغذِ زری ہو

پابوس نقشِ پا سے۔ تیرے جو کنکری ہو
جاکر فلک پہ اس کو۔ تاروں سے برتری ہو

ابرِ کرم سے تیرے کیا دور ہے کہ شاہا — کشتِ فلک میں پیدا سرسبزی و تری ہو
سورج کی جو کرن ہے گردوں سے لے زمیں تک — مانندِ عشقِ پیچاں پھر سر بسر ہری ہو
مریخ کو فلک پر، جس تیغ سے ہو ہیبت — دشمن کو بھاگ کر پھر، کیا اُس سے جانبری ہو
تیرے سے تیرے ہوئے ہیبت کا چاک سینہ — دل پر دلاوری کے۔ وہ تیغِ حیدری ہو
تیرے سوا جہاں میں۔ کون آج ہے توانا — جو دل کے ناتواں کو دیتا توانگری ہو
جاروب کش ہے تیرے مشکوئے خسروی کا — زیبا ہے ماہ کو گر۔ فرمانِ مہتری ہو
خورشید نذر لائے جب افسرِ شعاع سے — منشورِ افسری پر، توقیعِ خاوری ہو
ابروئے تاج بخشی جس دم کرے اشارت — کشتی میں لے کے حاضر وہ افسرِ زری ہو
لائیں پئے سواری، توسن کو جب سجا کر — صورت میں ہو وہ پتلی، پرواز میں پری ہو
چلتا ہوا ہے افسوں اڑتا ہوا چھلاوہ — پھر اُس سے آگے بڑھ کر کیا سحرِ سامری ہو
کیا برشِ قلم واں دکھلائے شہسواری — جب توسنِ تصور کھاتا سکندری ہو
خاکِ قدم ہو اس کی۔ اہلِ نظر کو سونا — جو نقشِ سم ہے اس کا وہ مہرِ اکبری ہو
تو اُس پہ بر سرِ زیں، جوں رحل پر ادب سے — اُم الکتاب لیکر جبریل نے دھری ہو
کس وصف کی ہو سیڑھی ہاتھی پہ تیرے موزوں — کرتا نہ فیلِ گردوں جس کی برابری ہو
اس طرح جلوہ گر ہے تو بر سرِ عماری — برجِ حمل میں جیسے خورشیدِ خاوری ہو
چار آئنہ بدن پر دشمن کے گر سجا ہو — اور سر پہ اُس کے ٹوپی فولاد کی دھری ہو
پر جیسے آئنے سے۔ تیرِ نگاہ گزرے — یوں غرق اُس میں تیری ہر تیر کی سری ہو
کیا سعد و نحس کا یاں رہوے حساب باقی — جب چھائی آسماں پر فرخندہ اختری ہو
ختمِ ثنا ہے کرتا اب ذوق اس دعا پر — تو مدعا پہ اس کے گر ملتفت ذری ہو
جو ہو ترا دعا گو گلرنگ ہو وہ کھل کر — بد خواہ اگر ہو خنداں صد برگ جعفری ہو
ہو سیرِ بخت تیری گر اوجِ میمنت پر — رفتارِ بختِ اعدا بر رجعِ قہقری ہو

حکیم مومن خان مومن بھی اسی زمانے کے شاعر ہیں۔ دیوان میں چھ مثنویوں کے علاوہ قصیدے بھی ہیں۔ انتہائی خوبصورت تھے، خوش وضع اور عاشق مزاج تھے جوانی کی بہاریں جب ختم ہو گئیں اور شباب ڈھل گیا تو نماز روزے کی سختی کے ساتھ پابندی کرنے لگے۔ مومن کا حافظہ بہت قوی تھا۔ نجوم میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کا جوانی کا کلام عشق وحسن میں ڈوبا ہوا ہے مگر آخر عمر میں کلام میں متانت، سنجیدگی اور وقار دکھایا تھا۔ مومن دہلوی نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے استاد تھے —— امیروں اور رئیسوں کی درباداری اور خوشامد سے انہیں انتہائی نفرت تھی۔ انہوں نے رسُولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور صحابہؓ کرام کے قصیدے کہے ہیں اور ان میں زورِ طبع اور زورِ بیان کا مظاہرہ کیا ہے —— صرف ایک قصیدہ راجا اجیت سنگھ رئیس پٹیالہ کی شان میں کہا ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہ تیرہ اختری
کثرتِ دود سے سیاہ شعلۂ شمع خاوری

اس قصیدہ پر رئیس پٹیالہ نے انہیں ایک ہتھنی انعام میں دی تھی جو انہوں نے بیچ دی تھی اسی لئے تو اوج نے طنزیہ کہا تھا

جہنموں میں وہ مومن مکان لیتا ہے
نجومی بن کے جو ہتھنی کا دان لیتا ہے

اپنی ذاتی قابلیت پر مومن کو گھمنڈ تھا —— تاریخ گوئی میں کمال رکھتے تھے

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومن کا وہی شعر ہے جو غالب کو بے حد پسند تھا اور وہ کہا کرتے کہ کوئی میرا سارا دیوان لے کر یہ شعر مجھے دے دے۔

مومن کے قصائد بلند پایہ ہیں۔ نازک خیالی اور بلند پروازی کی مہک سے

مملو ہیں۔ استعاروں اور تشبیہات و تلمیحات کے سنہری پن نے ان میں اجالا سا کر دیا ہے۔ کلام میں جگہ جگہ فارسی کی عمدہ ترکیبیں اور دل کش تراشیں ہیں جو لطف و کیف میں اضافہ کر کے رکھ دیتی ہیں۔ اصطلاحات علوم و فنون بےشمار ہیں۔ فارسیت کی بھرمار بعض اوقات ان کے کلام کو سخت اور گنجلک بنا دیتی ہے

مومن کا بلند مقام ان کے تغزل میں ہے۔ وہ قصیدوں میں کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں کر سکے۔ کیونکہ انہیں فضول قسم کی خوشامد سے نفرت تھی ــــ ویسے ان کے قصیدوں سے فن بخوبی مترشح ہے اور ان میں الفاظ کی بھول بھلیاں ہیں اور علمیت کا ثبوت ملتا ہے۔ انہوں نے ۹ قصیدے لکھے ہیں۔

نمونۂ کلام (مومن)

قصیدہ در مدح افضل الانبیا حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

چمن میں نغمۂ بلبل ہے یوں طرب مانوس
کہ جیسے صبح شب ہجر نالہائے خروس

ہے اس طرح فرح انگیز کوکوئے قمری
کہ جیسے فوج مظفر میں شور و غلغل کوس

نوائے طوطیٔ شکر فشاں کی لذت سے
سماع و رقص میں اہلِ مذاق جوں طاؤس

غبار صحنِ چمن کیمیائے عیش و نشاط
بہار لالہ و گل سیمیائے عرض و شموس

صفا سے وہ در و دیوار باغ کا عالم
کہ آشیانے میں دشوار طائروں کو جلوس

نہ ہے فریب صفا خاک سبز ہے گلچیں!
پڑے ہے جو دستِ گلزار میں گلو نکلے نکوس

ہجوم سبزہ نے کی بسکہ رنگ آمیزی
زمین پہ چادر مہتاب بن گئی سندوس

ہوئی ہے سقف فلک مانع قد افرازی
وگرنہ بید کہاں اور ترقی معکوس

ہو کیوں کہ ایسی رطوبت پہ سنگِ راہ نسیم
بنا ہے شبنمِ گل آبگینۂ فانوس

خزانۂ خاک میں ہر رنگ دل ملاتا ہے
زبسکہ لفظ خزاں جانتے ہیں سب منحوس

نوید مالکِ گلزار کو کہ زر کی جگہ
ہر ایک کاسۂ گل میں ہے گنج دقیانوس

یہ آب و رنگ کہاں لعل اور زمرد کا
مگر دیا ہے گل و سبزہ نے انہیں ملبوس

چمن کی خاک سے گلگونہ اب بناتے ہیں
شگفتہ تا دمِ رخصت بھی ہو عذارِ عروس

خمیدہ شاخ سے یوں رنگِ گل جھلکتا ہے
کہ جس طرح سے بھڑک اٹھے مشعلِ منکوس

پڑھے ہے مرغِ گلستاں وہ مطلعِ رنگین
کہ سن کے بس جیسے رہ جاتے سن ہی بلبلِ طوس

زبان لالہ کہاں اور مدیحِ تاجِ خروس
گرا ہے خاک پہ کیا لعل افسرِ کاؤس

ہزار داغ ہو پروائے آفتاب کسے
پرستشِ گل خورشید میں ہے گرم مجوس

شگفتہ تر ہے چمن روضہ ہائے جنت سے
ہنسی کی جا نہیں گر صومعہ نشیں ہے عبوس

خلل پذیر رطوبت ہوا دماغِ بہار
عجب کہ سبزۂ خوابیدہ کو نہو کابوس

ہے دشت بزمِ طرب کثرتِ نتائج سے
نہ کیوں ہو شکلِ مجازی کہ نازِ شکلِ عروس

ہوائے سیرِ چمن زار کی وہ مستی ہے
کہ خلق کو ہوئی مشکل حفاظتِ ناموس

عجب نہیں مئے گلرنگ کی ہوس ہے اگر
خود آکے شیشۂ خالی ہیں ہو پری محبوس

مزاجِ دہر میں یہ اعتدال آیا ہے
کہ جس نبات کو دیکھو وہ صالح الکیموس

عجب نہیں کہ بسانِ مگس عسل اگلے
گر اندزوں ہو کوئی مبتلائے ایلاؤس

نمو کا معجزہ صلّے علےٰ کہ پھر گندم
ہوائے جنبشِ غربال سے بنے ہے سبوس

رطوبت ایسی نظر آئی داغِ لالہ میں
کہ چاک چاک حسد سے ہوا دلِ اقیوس

قبائے گل کو گر اطلس سے دیجئے تشبیہ
سیاہ پوش جعل ہو دردِ ماتم سوس

قوائے نامیہ کو ناگوار ہے کتنا
کہ ہضمِ رابعہ محتاج ہو سوئے کیلوس

ہوا ہے اب تو یہ سرمایۂ لطافتِ آب
کہ پشتِ ماہی پہ گلہائے اشرفی ہیں فلوس

کہیں جہان میں کائی نظر نہیں آتی!
کہ صرف رنگرزاں ہوگئی بجائے الوس

سرایۂ نمِ آبِ وضو سے دور نہیں
جو سبزہ زار بنے ریشِ زاہدِ سالوس

عجب کچھ نہیں شادابیٔ زمیں سے اگر
زیادہ تر کرے سیلانِ خونِ گل خاموس

مگر اس بہار کی یعقوبؑ کو ہوا لگ جائے
شمیم جامۂ یوسفؑ کبھی نہ ہو محسوس

ہوا سے بسکہ گلِ شمع بھی ہے عطر آگیں
عدیلِ طبلۂ عطار بن گئی فانوس

یہ گل کھلاتی ہیں آب و ہوا کی تربیتیں
کہ ہے پیالہ کو لافِ منافعِ ملبوس

ہوائے جنبشِ اوراق سے ہیں عطر فروش
لغاتِ وردکہ ہیں ثبت صفحۂ قاموس

منہوں گرمیٔ دمِ مشاطۂ نسیم کی دیکھ
کہ مشک نافہ ہے گوئے غنچہ ہائے زلفِ عروس

صفات آئے جو آئینۂ ہوا میں نظر
ہوا خواص و عوارض کو اعتبارِ نفوس

صدا نکلتی ہے ملکہ ہوا سے کیا ہو فرق
کہ بانگِ خندۂ گل ہے کہ نالۂ ناقوس

عجب ہوا ہے کہ فیضِ ہوا سے ہوتا ہے
شکم میں خستہ کے نشو و نمائے اصل السوس

غریقِ آبِ خجالت ہوا کے فیض سے ہوں
کہ گل ہوا ہے مرا غنچۂ دلِ مایوس

ہوا ہے کونسی ایسی مگر نہ بہنے کی
دمِ مسیح کہ ہے جس کی حسرتِ پابوس

شرف مدینہ کو جس سے ہے ہو نہ وہ ہو
جسے بتاتے ہیں محبوبِ حضرتِ قدوس

جو خواب میں بھی کبھی دیکھتی جمال اس کا
تو دیتی دل کو نہ یوسفؑ کو دخترِ طیموس

جو شمع بزم کہوں اس کے روئے تاباں کو
کہاں وہ ماہ بنے نورِ شعلہ و فانوس

وہ کون احمدِ مرسل شفیعِ ہر دو سرا
جو خلق کا سبب اور باعثِ معادِ نفوس

جہاں مطاعِ شہنشاہِ آفتاب نشاں
فلک سریر و قمر طلعت و ملک ناموس

سیاہ چشموں کو مشکل نگاہ دزدیدن
پر اس کے حفظ سے ہے ملکِ معدلت محروس

نگاہ بانیٔ عصمت سے وہ رواجِ حیا
کہ چشم چار نہ ہوں نرگس اور ارقیبوس

ہے دورِ عدالت میں اس کے شیرِ عریں
شباں کی ضربتِ بیجا سے نالشِ جاموس

یہ ہم میں دوں اسے نیساں سے کس طرح تشبیہ
کروں میں جان کے کیونکر ترقیٔ معکوس

کہ جس کی بخششِ یک روزہ کو وفا نہ کریں
ہزار سالہ گہرہائے قلزمِ قاموس

یہ جی میں ہے کہ پڑھوں اور ایک وہ مطلع ۔۔۔ جو ہو ہر اک متنفس کی طبع سے مانوس

ترے ہے فیض سے ہر قطرہ آبیارِ مجوس

ترے ہے نور سے ہر ذرّہ جلوہ زارِ شموس

بخشیہ عفو ترا طالبِ گنہ گاراں ! ۔۔۔ مدام رحم ترا دردمند کا جاسوس

ترے حسود کی نسبت سے جل رہی ہے نہ کیوں ۔۔۔ ہجوم شعلہ سے دوزخ ملے کفِ افسوس

تری غلامی کی دولت سے خاکپائے بلال ۔۔۔ سفیدۂ رُخِ فغفورِ چین و خسروِ روس

نجبیدہ کس لئے نہ آسمان بنے تجھے بھلا ۔۔۔ نہ تھا ازل سے جو مدِ نظر ترا پابوس

بہا میں دیتی ہے ماہی دفینہ ہائے زمیں ۔۔۔ یہ بڑھ گئی ترے سکے سے قدرِ تا بفلوس

ہے احتساب ترا مانع لباسِ حریر ۔۔۔ نہ چھینک دے کہیں چرخ اطلسِ ملبوس

ترا وہ خوف کہ رُک جائے تا گلو آ کر ۔۔۔ نہ نکلے معبدِ ترسا میں نالۂ ناقوس

یہ مے کو نہی جہانسوز نے جلایا ہے ۔۔۔ کہ مغ نہ کر سکے فرقِ صراحی و فانوس

زبس شراب کو بھی آفتاب کہتے ہیں ۔۔۔ نہ آسمان کے واژوں ہے مدام کیوس

فریبِ وعدہ پہ چھوڑی بتوں نے جھوٹ قسم ۔۔۔ سنا زبسکہ زباں سے تری وعیدِ غموس

دمِ معاف ترے دشمنوں کے لشکر میں ۔۔۔ صدائے نوحہ و شیون ہے شور و غلغلِ کوس

دو نیم ہوں تری شمشیر کے تصور سے ۔۔۔ بسانِ ساغرِ خورشید کاسہ ہائے رؤس

ملا دے گاؤ زمیں گاؤ چرخ سے نیزہ ۔۔۔ بٹھا دے خاک پہ شیرِ سپہر کو دبوس

قطعہ

اگر کہے مدد اے یا محمد عربی ۔۔۔ صغیر مرگ ہو رستم کو نعرۂ [illegible]

مخالفوں کو ترے دو جہاں جہنم ہے ۔۔۔ کہ تاب مہر سے جلتے رہے ہیں یاں بھی مجوس

براقِ اسپ ترا اور دے فرشتہ رکاب ۔۔۔ کہاں ہو چشمِ بشر ایسی پاؤں تلے موس

نہ جس کے دھیان میں مضمونِ قاب قوسین آتے ۔۔۔ وہ دیکھے ترے زمین و مکان کا قدبوس

ترے عدو کی خرابی کا کچھ علاج نہیں
نہ ہو قبولِ دعا سے بھی رفعتِ بسبوس

ترے خیال سے اصحابِ کہف کو ہے یہ چین
وگرنہ خواب کہاں اور زمانِ دقیانوس

ظہور ہی ہوتی تقدیمِ انبیاؑ کے نہ تھا
ترے وسادۂ دولت پہ احتمالِ جلوس

شہا ستم ہے کہ تیرے مدیح خواں پہ کرے
ہزار گونہ ستم روزگارِ ناما نوس

کچھ انتہا بھی کواکب کے دورِ بیجا کی
ہمیشہ ہے مرے طالع میں اجتماعِ نحوس

جو اپنی حسرت و ارمان میں بیان کروں
نہ تاب لائے دلِ سختِ زاہدِ سالوس

جفا کو آئے مری دل شکستگی پر رحم
بلا کرے مرے احوالِ زار پر افسوس

ملے ہیں خاک میں کیا کیا مرے فنون و علوم
خدا کسی کو نہ دے ایسے طالعِ منکوس

حکیم وہ ہوں کہ جاتے رہیں حواس اگر
کرے معارضہ مرو فترِ عقول و نفوس

طبیب وہ ہوں کہ ہو سوزِ سینۂ بلبل
نظارۂ رخِ گلفام سے مجھے محسوس

جو ہوں معالجِ مبطوں تو قابضِ ارواح
کرے دوائے رواجِ طریقِ جالینوس

ورم ہو چارہ گرِ قبض تا بدستِ لیتھم
کیا ہو میں نے جو تجویز روغنِ مغز فلوس

کروں جو گردشِ انجم کی میں رصد بندی
فدا ہو وجد میں آ کر روانِ بطلیموس

گواہ عصمتِ مریمؑ ہو کثرتِ اولاد
عقیمہ مجھ سے سنے گر بیانِ شکلِ عروس

طلسم ماہ لکھوں گر پئے زبان بستن!
بنائے مہر دہن چرخ تختۂ جاسوس

یقین کہ زہرہ و خورشید میں مقابلہ ہو
پڑھوں جو میں پئے دوری دعا بدربطوس

جو میری نثر کے دیکھے لآلیِ منثور
اٹھا لے مسندِ حشمت حباب بحر کا دُس

بغرض گر کرۂ خاک کو کہوں دائرہ
شکستہ اسپ لگی ہووے چیستانِ فردوس

فنونِ نظم میں میں نے نکالی ایسی راہ
طریقہ شعرائے سلف ہوا مطموس

مرے کلام ثریا نظام کا مل کر
وہ تیرہ روز جو برجیس کو کہے منحوس

جو دیکھیں میری طبیعت کی گوہر افشانی
شریکِ درد ہوں محمود و نکتہ پرورِ طوس

دیئے ہیں میرے حسد نے زبس ہزاروں داغ | روا ہے باندھئے گر عندلیب کو طاؤس
تماش دیکھ کے رنگینیٔ سخن کا مرے | حریر لالہ و گل شرم سے ہوا مدروس
خدا کے واسطے گرم دعا ہو مومنؔ بس | کہ منتظر ہے ازل سے اجابتِ قدوس
ہے جب تلک گل و برقسمتِ نہال و شجر | ہے جب تلک دِل لالہ میں داغِ حسرت دوس
مدام پھولے پھلے دوستوں کا نخلِ مراد | رہینِ داغ عدو کا رہے دِل مایوس

۱۸۵۲ء میں کوٹھے پر سے گرنے کی وجہ سے مومن کا انتقال ہوا اور دلّی دروازہ کے باہر آپ سپردِ خاک ہوئے۔

میرزا غالب کو قصیدہ گوئی پر عبور حاصل تھا۔ وہ باکمال قصیدہ گو تھے لیکن اپنے فن و کمال کی جولانیاں انہوں نے فارسی قصیدوں میں دکھائی ہیں۔ اور فارسی قصیدہ گوئی میں انہیں یقیناً اچھا درجہ حاصل ہے۔ مرزا کے فارسی قصائد کی تعداد چونسٹھ ہے۔ جن میں سے بہت سے قصیدے انگریزی حکام کی شان و ستائش میں لکھے گئے ہیں۔

اردو قصیدے کی طرف انہوں نے بہت کم توجہ دی ہے۔ ان کے ہاں (مروجہ دیوان میں) اردو کے صرف تین قصیدے ہیں اور وہ بھی کوئی زیادہ طویل نہیں — ان قصیدوں میں سے دو حضرت علیؓ کی منقبت میں اور ایک شاہ ظفر کی مدح میں عید الفطر کے موقع پر لکھا گیا ہے

مؤخر الذکر قصیدہ جو بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہے۔

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

لاجواب قصیدہ ہے — زبان میں شیرینی و حلاوت ہے بیان کی روانیاں میں سلاست برجستگی پر بہار ہے — اور انتہائی حسین مضامین نکالے ہیں — تشبیب اور گریز میں انوکھے پن اور سادگی کی بوقلمونیاں ہیں — اس قصیدے میں مہ نو سے مخاطب

کرتے ہوئے تمہید شروع کرتے ہیں اور پھر گریز میں چہلتا اور شوخیوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے، اپنی معجز بیانیوں سے مدح کی طرف جھکتے ہیں — اور آخر تک کمال کے حسین شگوفے بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔

اسی قصیدے کی گریز اور مدح کے چند شعر دیکھئے۔ ان میں کتنی حلاوت اور کس قدر مزہ الفاظ کا چناؤ ہے — حسنِ ادا ہے۔

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ
اے پری چہرہ پیک تیز خرام!
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا!
ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن
نامِ شاہنشہِ بلند مقام؟
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ
مظہرِ ذوالجلال والاکرام،
شہسوارِ طریقۂ انصاف
نو بہارِ حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز
جس کا ہر قول معنیٔ الہام
بزم میں میزبانِ قیصر و جم
رزم میں اوستادِ رستم و سام
جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم
جرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام

وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے
ایرج و تور و خسرو و بہرام

غالب کے قصیدوں میں ایک وقار ایک شان اور نرالی کیفیت ہے بعض اشعار تو ندرت و اعجاز کی لڑیاں ہیں —— مرزا نے اپنی تمام تر فنی صلاحیتیں اور حسن ذوق غزلوں کے سنوارنے میں صرف کر دیا —— اور اپنے اچھوتے بیان اور بے مثال تخلیقی بصیرتوں سے انہیں جگمگا کے رکھ دیا۔ غزل میں آج تک کوئی بھی ان کی برابری کا دعویٰ نہ کر سکا۔ غزل کا جمالیاتی نظام، اس کی روح، اس کا پیکر سبھی تو ان کے رہینِ منت ہے۔

اس میں ذرہ بھر بھی شک نہیں کہ اگر غالب اردو قصیدہ کی طرف توجہ دیتے تو وہ سودا و ذوق سے کسی طور بھی پیچھے نہ رہتے اور اپنی آتش نوائیوں، زمزمہ سنجیوں، جدت طرازیوں اور سحر خیزیوں سے اس صنف میں گوناگوں اضافے کر کے اردو زبان پر ایک اور احسان کر جاتے۔

نمونہ کلام (غالب) منقبت میں

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بےکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم
لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں

نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت
سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

مثلِ مضمونِ وفا باد بہ دستِ تسلیم
صورتِ نقشِ قدم خاک بہ فرقِ تمکیں

عشق بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس
وصل زنگارِ رخِ آئینۂ حسنِ یقیں

کوہکن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بے ستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز؟ — کس نے پایا اثرِ نالۂ دلہائے حزیں؟
سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں لیکن — نہ سر و برگِ ستائش نہ دماغِ نفریں
کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ، — یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں
نقشِ لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر — یا علی عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں
مظہرِ فیضِ خدا جان و دلِ ختمِ رسل — قبلۂ آلِ نبی کعبۂ ایجادِ یقیں
ہو وہ سرمایۂ ایجاد جہاں گرمِ خرام — ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں
جلوۂ پرداز ہو نقشِ قدم اس کا جس جا — وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں
نسبتِ نام سے اس کی ہے یہ رتبہ کہ رہے — ابداً پشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں
فیضِ خلق اس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا — بوئے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں
برشِ تیغ کا اس کی ہے جہاں میں چرچا — قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں،
کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے — رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بت خانۂ چیں
جاں پناہا! دل و جاں فیض رسانا! شاہا! — وصیِ ختمِ رسل تو ہے بہ فتوائے یقیں
جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیمبر منبر — نامِ نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں
کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب — شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں
آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ — رقمِ بندگیِ حضرتِ جبریل امیں
تیرے در کے لئے اسبابِ نثار آمادہ — خاکیوں کو جو خدا نے دیئے جان و دل و دیں
تیری مدحت کے لئے ہیں دل و جاں کام و زباں — تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں
کس سے ہو سکتی مداحیِ ممدوحِ خدا! — کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں
جنسِ بازارِ معاصی اسد اللہ اسد — کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں
شوخیِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخِ طلب — ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بسکہ یقیں
دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسنِ قبول — کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمیں

زخمِ شبیرؑ سے ہو سینہ میاں نمک لبریز — کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں
طبع کو الفتِ دلدل میں یہ سرگرمیِ شوق — کہ جہاں تک چلے اُس سے قدم اور مجھے جبیں
دلِ الفت نسب و سینۂ توحید فضا — نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں
صرفِ اعدا، اثرِ شعلۂ دودِ دوزخ
وقفِ احباب گل و سنبلِ فردوسِ بریں

اس کے بعد متاخرین کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں سحر، منیر شکوہ آبادی تسلیم لکھنوی، جلال لکھنوی، امیر مینائی، داغ دہلوی اور قدر بلگرامی جیسی کاکوروی ایسی ہستیاں اردو قصیدہ گوئی میں ممتاز نظر آتی ہیں۔ ان سب نے قصیدے کی روایات کی دل و جان سے قدر کی ہے اور عزت کی نگاہوں سے دیکھا ہے — یہ دور قصیدے کو آگے نہیں بڑھا سکا اور نہ ہی قصیدے کی ترقی میں معاون ثابت ہوا۔ ماحول ساز گار نہیں تھا اور اب وہ مخصوص فضا نہیں رہی تھی جس کا قصیدہ متقضی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ قصیدہ اس دور میں نور و شعلہ کا کوئی رنگین اور جگمگاتا ہوا اور نیا تاج اپنے سر پر نہ رکھ سکا۔ اس کی چونکا دینے والی ہیبت اور باوقار گھن گرج ماند سی پڑ گئی۔ البتہ پھر بھی ان صاحب استعداد سخنوروں اور باذوق قصیدہ گو شعرا نے اپنے شعور اپنی علمیت اور اپنی پیار زدہ کاوشوں سے اسے سنبھالے رکھا اور کچھ نہ کچھ اس صنف میں اضافہ کیا ——— اور یہ انھی بزرگ ہستیوں کا فیض ہے کہ ایسے ناساز گار ماحول میں بھی قصیدہ تبسم کے آبگینوں سے تہی نظر نہیں آتا۔ اور اس کے مکھڑے کے گردِ تخیل کی بوقلمونی، ادبیت، شگفتگی، شادابی اور آن بان، ہالہ کیے ہوئے دکھائی دیتی ہیں ——— قصیدے نے اردو کا سہاگ اس دور میں بھی قائم رکھا ہے۔

امان علی سحر لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ حسین اور صاحب ذوق تھے۔ قدر

کی وجہ سے انہیں بڑی صعوبتیں جھیلنی پڑیں۔ مختلف مقامات کی خاک چھانی، اور پیدل سفر کرنا پڑا ۔۔ غدر دھیما پڑا تو آپ نے لکھنؤ کا رُخ کیا۔ لیکن راستے میں ہیضے کی وجہ سے وفات پاگئے۔ ان کا دیوان مختصر سا ہے۔ شاعری کی دوسری اصناف کے علاوہ اس میں دس قصیدے بھی ہیں، جن میں سے چند نامکمل اور مختصر ہیں بعض قصیدوں میں بہاریہ تمہیدیں اپنے اندر سرمدی حسن سمیٹے ہوئے ہیں۔ مگر گریز میں کوئی دلکشی نہیں ۔۔ زبان میں متانت ہے جو قصیدے کے لئے کچھ موزوں نہیں پھر بھی انداز بیاں دلاویزی لئے ہوئے ہے ۔۔ انھوں نے امراء لکھنؤ و اودھ کے علاوہ، بہارستان عیش باغ کی تعریفیں زیادہ کی ہیں۔

نمونہ کلام (سحر)

قصیدہ بہاریہ

اے ہوا جا کے بنارس سے اڑا لا بادل — چاہیئے ہندوی سوسن کے لئے گنگا جل
کام کرنے میں ہو بدلی کی اندھیری میں خلل — باغبانوں کو جو بجلی نہ دکھاوے مشعل
صحن گلزار ہے پھولوں سے معطر ایسا — شرم سے عطر میں ڈوبی ہے زمین صندل
قمریاں کہتی ہیں مستی میں جو چلتی ہے ہوا — لوٹ جائے نہ کہیں سرو چمن کی بوتل
اے فلک باغ میں دم بھر جو کبھی ابر نہ آئے — جوشش مے سے نہیں پنبہ مینا بادل
باغ میں آ کے نہالوں پہ جھکی ہے بدلی — بارہا نہروں سے پی لیتے ہیں پانی بادل
مینہ برسنے میں جو دونی نظر آتی ہے بہار — چشم نرگس یہ سمجھتی ہے کہ میں ہوں احول
دوسرے قطعہ کرلے ابر بہاری فوراً — باغ میں پانی کی چادر ہو اگر مستعمل
روشیں صاف ہیں ایسی کہ پھسلتی ہے ہوا — پھول ہنس ہنس کے یہ کہتے ہیں سنبھل دیکھ سنبھل
آنکھیں نرگس کی بھی ہر وقت سکا کرتی ہیں — آتش گل سے اگر گرم ہے بلبل کا بغل
اب نہ آئے گی خزاں اور نہ جائے گی بہار — باغ کو گھیرے ہوئے چار طرف ہیں بادل

دم بدم رعد کی آواز چلی آتی ہے — شیشہ و جام سے خالی نہ رہے دست و بغل
آج تو خوب سی جی کھول کے پی لو یارو — فکر فردا نہ کرو دیکھ لیا جائے گا، کل
وجد کرتے ہیں ملک ساز کی آوازوں پر — دل زہرہ بھی یہ کہتا ہے کہ دو پاؤں تو چل
قہقہے رندوں کے تا عرش بریں جاتے ہیں — آگیا اب تو فرشتوں کی عبادت میں خلل
ہو گئی عابد و زاہد کو بھی تاثیر نشاط — کر دیا ہاہو کی آواز نے دل کو بیکل
مدرسوں سے نکل آئے ہیں مدرس سارے — دوڑ حجروں سے وہ عمال جو پڑھتے تھے عمل
مل گئے آن کے رندوں میں لگے پینے شراب — عقل جاتی رہی نشہ نے بنایا مختل
وہ کیا شعر سحر ہیں کہ بقول عرفی — بلبل آمد بہ طلب بلبل بہ تمنائے غزل

قطعہ

آب و تاب ایسی ہے سبزے میں ٹھہرتی نہیں آنکھ — سبزہ ہر اک نظر آتی ہے زمرد کی کھرل
عکس گلنار و سمن پانی میں یوں ہیں جیسے — ورق سیم و طلا کیوڑے میں ہوتے ہیں حل
آن کر پیڑوں کے تھالوں میں نہاتے ہیں لال — سوکھتے سوکھتے ہو جاتے ہیں بالکل ہریل
اثر باد بہاری سے بنے ابر بہار — مینہ برستے ہیں اگر اوڑھ کے نکلو کمبل
اسقدر شوق تماشائے چمن ہے سب کو — نیم رخ کھینچیے تصویر تو ہو مستقبل
صندلی رنگ ہوائیں جو چڑھائیں تیوری — بڑھے ہر چین جبیں صورت شاخ صندل
قوت نامیہ ایسی ہے کہ بڑھتے بڑھتے — کسی میں پھول لگیں پھوٹے کسی سے کونپل
کس قدر کیاریوں میں جمع ہیں گلہائے فرنگ — یہ بڑے دن کے لئے ہوتی ہے شاید کونسل
کیوں نہ دیوانے ہوں انسان ہوا سے انکی — دامن باد بہاری ہے پری کا آنچل
اب تو ہاتوں میں نکلتی ہیں ہزاروں شاخیں — باغبانوں میں جو ہوتی ہے کبھی رد و بدل

سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی بڑے قادر الکلام اور پرگو شاعر تھے یہ کلکتہ مرشد آباد اور الہ آباد بھی رہے۔ لیکن لکھنؤ کے عاشقوں میں سے تھے — لکھنؤ میں

کچھ عرصے نواب علی اصغر خان اور دوسروں کی ملازمت کی اور اس کے بعد نواب علی بہادر والئی باندہ کے یہاں ملازم ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء میں ایچ کاک دیبی باندہ کے قلعے میں قتل کر دیئے گئے تو انگریزوں نے یہ قلعہ فتح کر کے نواب کو گرفتار کر لیا۔ منیر پر بھی مقدمہ چلا اور کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی۔ منیر نے قید کے حالات لکھے ہیں۔

کوٹھڑی تاریک پائی مثل قبر — تنگ تر تھی حلقۂ زنجیر سے
تھا بچھونا ٹاٹ کمبل اوڑھنا، — گرم تر پشمینۂ کشمیر سے

منیر ۱۸۶۰ء میں رہا کر دیئے گئے تھے۔

منیر کے قصائد کی تعداد اٹھائیس ہے، جن میں آٹھ یا نو ابتدائی قصائد نعت و منقبت میں ہیں اور باقی امرأ و والیان ملک کی شان و مدح میں ہیں۔ زیادہ قصائد نواب کلب علی خاں والئی رامپور کی ستائش میں لکھے گئے ہیں۔ منیر کامیاب قصیدہ گر تھے منیر کی قادر الکلامی مسلّم ہے۔ بیان میں روانیاں ہیں۔ مضامین اور تخیل کی بلند پروازی ان کے قصائد کا حسن ہیں —— الفاظ کی شان و شوکت، معنوی بلندی فکر کی گوناگونی۔ نعت و منقبت اور قصائد میں نمایاں ہے —— منیر کا ایک قصیدہ حضرت علیؓ کی منقبت میں ہے۔

پرتو مہر جو ہو شمع شبستان حمل
غازۂ صبح ملے قشقۂ ہندوئے زحل

اس قصیدے میں موسم بہار اور گل و گلزار کے مضامین انتہائی چابکدستی اور فنکارانہ صلاحیتوں کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں اور نئی نئی راہیں نکالی ہیں۔ زبان نو بہ نو اور تازہ بہ تازہ ہے۔

منیر شکوہ آبادی کا نعتیہ قصیدہ جو انہوں نے قید کی حالت میں لکھا ہے محاکات کی اچھی مثالوں اور بہترین مضامین کی عکاسی کرتا ہے۔ رات کا سماں یوں باندھتے ہیں۔

مہیب رات تھی ایسی کہ بس خدا کی پناہ
زبانِ ہر بشر و مو پہ تھی الاماں کی پکار

مکانِ گورِ کہن فرش خاک بالش سنگ
کھڑے تھے بھاگنے کے واسطے در و دیوار

عجب نہیں ہے جو آنکھوں کی راہ بھولی نیند
اندھیرے گھر میں غش آ آکے پھر گیا کئی بار

اندھیرے گھر میں نہ ملا نیند کو مقام پناہ
لرز کے مردوں کی آنکھوں میں جا چھپی اک بار

چراغ جا کے جلا لائے غول دوزخ سے
نہ پائی آتش روشن میانِ شہر و دیار

چراغِ خانۂ مفلس کی طرح ماہِ فلک
چمک کے شام کو نکلا نہ صبح تک زنہار

نہ لکھ سکے جو اندھیرے میں میری کیفیت
فرشتے کاندھوں سے گھبرا کے ڈر گئے للکار

بلا رفیق و فلک ہم نشین و ہم مہمان
ہزاروں آفتیں دربان فتنہ چوکیدار

سرہانے بیٹھی ہوئی بیکسی لیے رومال
کھڑی تھی پائینتی کرپاس جاتے خدمتگار

متاخرین میں امیر مینائی کو بلند درجہ حاصل ہے۔ صاحب زہد و تقویٰ اور صوفی مشرب بزرگ تھے۔ معاصروں میں اپنے علم و عمل، استعداد اور قابلیت کی وجہ سے ممتاز تھے۔ غدر سے پہلے واجد علیشاہ (اودھ) کے دربار سے منسلک رہے لکھنؤ کی تباہی کے بعد نواب یوسف علی خان والی ریاست رامپور کی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ رامپور میں اس وقت (دلّی اور لکھنؤ کی ویرانی کے بعد) ہر فن کے کامل اہم موجود تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ رامپور میں دلّی اور لکھنؤ کے شاعروں اور فنکاروں کا جھرمٹ لگا تھا۔ اور شعر و شاعری کے چشمے اُبل رہے تھے — نواب یوسف علی خان کے انتقال کے بعد تو نواب کلب علی خان کے عہد حکومت میں رامپور کے شباب میں اور بھی شدت پیدا ہو گئی — یہ زمانہ امیر مینائی کی شاعری اور اقبال دونوں کا آئین ہے نواب کلب علی خان نے امیر کو ملک الشعراء کے خطاب سے نوازا۔ ان دونوں

سخنوری کی ندیاں اچھالے لے رہی تھیں، اسی لئے اُردو شاعری، اس دور میں ترقی کے لئے نمایاں درجہ رکھتی ہے ـــ امیر مینائی نے اپنے فن اور اپنی علمی استعداد کا بڑھ چڑھ کر مظاہرہ کیا اور قصیدے کے تن من کو سجا کے رکھ دیا۔ ان کے سات قصائد ہیں۔ چند مدحیہ قصیدے بصورت مسدس دیوانوں سے الگ مطبوعہ و غیر مطبوعہ ہیں۔ امیر مینائی کی طبیعت قصیدے کے لئے انتہائی موزوں تھی۔ فنی محاسن، اور معنوی خوبیوں کے علاوہ تخیّل کی بلندی اور الفاظ کی متانت و حلاوت ان کے قصیدوں کی رُوح ہے۔ تشبیب و تمہید اور گریز و تخلص کے انداز بھی انتہائی جاذبیت لئے ہُوئے ہیں۔

نواب کلب علی خان کی ستائش میں انہوں نے لامیہ کہا ہے۔ اور بہاریہ مضامین کی تخلیق کی ہے۔ اور اپنی فنکارانہ صلاحیت اور ذہانت سے ایک نئی ڈگر اختیار کی ہے ـــ اور فن کے پیچ و خم سے قصیدہ کی سجاوٹوں میں اضافہ کیا ہے۔ کہتے ہیں:-

عالم خواب میں پہنچا میں عجب باغ میں کل
شجرِ طور کو جس باغ کی سیکتے کونپل،

خواب میں باغ نظر آیا اور اسی لئے مضمون آفرینیاں، پابندیوں سے بے نیاز ہو کر، اچھوتے اور نئے پن کو اپنانے کے لئے مضطرب سی ہو گئیں ـــ تخیّل کو جلا ملی۔ اور موزون و رواں طبیعت نے تیکھے مضمون نکال کے سامنے رکھ دیئے:-

ایک شگوفہ تھا اسی باغ کا باغِ عشرت
ایک غنچہ اسی گلزار کا گلزارِ امل
ساغرِ عشرت رنگین وہیں کے وہ پھول
میوۂ مقصد دارین وہیں کے وہ پھل

فی الحقیقت متقدمین کے مقررہ ضوابط کا احترام کرتے ہوئے تمہید اور مدح میں بھی بلند معیار اور شاداب مضامین تخلیق کئے ہیں تمام قصیدہ سے ایک وقار جھلکتا ہے۔

امیر مینائی کی ہمدردیوں اور اُستادانہ چابکدستیوں نے قصیدہ کا من موہ لیا ہے۔ نواب کلب علی خان کی تعریف میں ان کا ایک اور قصیدہ ہے۔ جس کا ایک مطلع یہ بھی ہے۔

شب دوشنبہ جو لی خواب میں میں نے کروٹ
آئی اک حورِ لقا پاس الٹ کر گھونگھٹ

اس حورِ لقا کے سراپے اور اداؤں کو اس طور پر پیش کیا ہے کہ لطف و حسن کی نیم گرم ندیاں بہتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ گریز کرتے ہوئے حور لقا اپنے پیکر کو کسی دوسری ہستی کی پرچھائیں بتاتی ہے اور اس طرح مدح و ستائش کے مضامین پیدا کئے ہیں اور حسین مطالب نکالے ہیں ـــــ یہ قصیدہ شگفتگی و تازگی کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے اور اسی لئے امیر مینائی نے خود بھی اسے "لیلۃ القدر" کہا ہے۔

امیر مینائی نے رامپور میں ۴۲ برس انتہائی سکون و طمانیت کے ساتھ بسر کئے۔ ۱۹۰۰ء میں نظام حیدرآباد کلکتہ سے واپس آرہے تھے۔ وہ راستے میں بنارس بھی ٹھہرے۔ امیر نے یہاں ان کی ستائش میں ایک قصیدہ کہہ کر پیش کیا جسے نظام نے بے حد پسند فرمایا۔ اور امیر کو حیدرآباد آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ وہ عازم حیدرآباد ہوئے۔ داغ کے ہاں قیام کیا۔ یہاں امیر کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ مختصر علالت کے باعث (۱۳، اکتوبر ۱۹۰۰ء) انتقال فرما گئے۔ آخر عمر میں امیر مینائی کا کلام جوانی کے کلام سے زیادہ گرم اور پر لطف ہے۔

محسن کی صحبت میں امیر مینائی نے نعت گوئی بھی شروع کی تھی۔ اور محسن کے مشہور

قصیدے ابیات نعت کی تضمین کی۔

اگرچہ امیر مینائی نے فنی حیثیت سے نعت کو اختیار نہیں کیا لیکن ان کے کلام میں اہم نعتیہ مضامین کا حصہ نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس سلسلے میں حسب ذیل تصانیف زیادہ اہم ہیں

(۱) مسدس صبح ازل

(۲) مسدس شام ابد

(۳) مسدس لیلۃ القدر

(۴) مسدس ذکر شاہ انبیاء

(۵) خیابان آفرینش (۱۸۸۷ء) بیان ولادت آنحضرتؐ

(۶) دیوان نعتیہ ذکر شاہ انبیاؐ (۱۸۷۳ء)

(لکھنو کا دبستان شاعری (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

نمونہ یہ ہے (نعتیہ کلام)

اللہ کا جو گھر تھا وہی گھر تھا آپؐ کا
اک کہنہ بوریا تھا جو بستر تھا آپؐ کا
دل شاد کام غیبسے اکثر تھا آپؐ کا
خلق عظیم سب سے برابر تھا آپؐ کا
کوئی زیادہ تھا نہ کوئی کم نگاہ میں
خورشید کی شعاع کا عالم نگاہ میں

جب تک جہاں میں مشقت کیا کئے
باندھا شکم پہ سنگ، ریاضت کیا کئے
بیوہ زنوں کے کام میں محنت کیا کئے
محتاجوں کی ضعیفوں کی خدمت کیا کئے
بیمار آپؐ نے جسے پایا چلے گئے
مسکین غریب جس نے بلایا چلے گئے

امیر مینائی کے وہ قصیدے جو انھوں نے نواب واجد علی شاہ کی مدح میں کہے تھے۔ جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کے وقت ضائع ہو گئے۔ البتہ نواب کلب علی خاں والیٔ رامپور وغیرہ کی شان میں کہے ہوئے سات قصیدے آپ کے کلام میں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ نعتیہ قصائد اور چند قصائد اور چند مدحیہ قصائد بصورت مسدس بھی ہمیں میسر ہیں۔

نمونۂ کلام (امیر مینائی)

قصیدہ در مدح نواب کلب علی خان والیٔ رامپور (کل شعر ۱۳۲)

تا کجا کوتہی اے دستِ ہوس کر جیوٹ
پردۂ شرم رخِ شاہدِ معنی سے اُلٹ

جیتا ہو جو سواران سخن سے میدان
پھینکنا چاہیئے رہوارِ قلم کو سرپٹ

یہی گو ہے یہی میدان یہی معنی یہی لفظ
اپنی اپنی ہے دمِ معرکہ پر ڈانٹ ڈپٹ

پی چکے گو کہ مئے صاف کو اگلے مے نوش
رہ گئی ساغر و مینا و سبو میں تلچھٹ

خم ہیں میخانے میں ایسے بھی کہ ٹوٹے نہیں مہر
کھول منہ بھر کے صراحی کو لے پی جا غٹ غٹ

وہ قصیدے جو سنے مصحفی و انشاء کے
واقعی سکۂ رائج ہیں ولیکن سلیٹ

سخت بھڑکے جو تھے قافیۂ نا مانوس
کچھ بھی کاٹا نہ گئی تیغ زباں اُن کی اُچٹ

ذائقہ ہے تو فقط گرمی و بے باکی کا
پر فصاحت سے یہ کہتے ہیں کہ چل دور ہو ہٹ

ہمت فکر نے باندھی جو کمر بہرِ جواب
اول اول تو طبیعت کو ہوئی گھبراہٹ

آخر آخر یہ ہوئی نظم کی قوت پیدا
کر لیا تازہ مضامین کا علاقہ کورٹ

لو سنو گوش توجہ سے ذرا نظمِ فصیح
وہ نئے صاف نہیں نام کو جس میں تلچھٹ

شب وہ شیشہ جو لی خواب میں میں نے کروٹ
آئی اک حورِ لقا پاس اُلٹ کر گھونگھٹ

کچھ عجب فتنہ کہ اس کی جو نظر جائے اُکٹ
ساتھ ہی چرخ بھڑک کے لے یہ زمانہ کروٹ

شعلہ رخسار جفا کار قیامت آفت
شوخ عیار غضب قہر ہٹیلا و نٹ کھٹ

رحم دکھلائے جو منہ دور سے پھر جائے نگاہ
شرم آجائے تو آنکھیں کہیں چل دور ہو ہٹ

گر پڑے جان پر زیور کی چمک سے بجلی — کھینچ لے دل کو وہ پوشاک میں خوشبو کی لپٹ
وہ نگاہیں غضب آلودہ وہ مژگاں کی صفیں — لشکرِ صبر جنہیں دیکھ کے کھائے گھونگھٹ
سب کے انجم کا جو لشکر اُتر آئے مریخ — کھینچ کر تیغِ ادا جیت لے میداں جھٹ پٹ
پختہ کار اس کو جو دیکھیں طمعِ خام کریں — ثمرِ عیش رسِ حُسن میں وہ گدراہٹ
طرفہ چہرے کی لطافت وہ سنہری رنگت — دستِ افشارِ طلا سے بھی سوا نرماہٹ
آپ ہی چھیڑ کرے آپ ہی پھر حد سے بڑھے — توسنِ ناز کو پوٹی سے وہ پھینکے سرپٹ
مستیِ حسن سے گردن میں کبھی ڈال دے ہاتھ — بے چھوئے گاہ لجالو کی طرح جائے سمٹ
پتلیاں آنکھوں کی درپردہ اشاروں سے کبھی — ناچنے ہی کو جو نکلے تو کہاں کا گھونگھٹ
مانگ لے ٹھنک کے کبھی عشّاق کا دل — باندھ لے گاہ گلا کھول کے وہ زُلف کی لٹ
رُخ و گیسو پہ مرے اتنے مسلماں ہندو — مقبرے ہو گئے تعمیر، بھرے سب مرگھٹ
فتنۂ حشر کو دیکھے تو کہے زُلف سے آنکھ — لا جھٹے میں اسے دیر نہ کر دوڑ جھپٹ
طاقِ کاکل وہ پھکیتی ہیں کہ سر کی کوئی چوٹ — روک لے مڑ کے تو وہ جھک کے لگاتے پالٹ
ہاتھ چھو جائے جو گیسو کو تو کھائے یوں پیچ — جس طرح کاٹ کے کالا کوئی جاتا ہے پلٹ
دیکھ کر ابروئے پیوستہ یہ ہوتا تھا گماں — پہلوان دو ہیں کہ کشتی میں بھڑے ہیں غٹ پٹ
جلوہ گر مردمِ چشم و صفتِ مژگاں ہیں یوں ہاٹ — حُور بیٹھی ہے درِ خلد پہ کھولے ہوئے پٹ
پھیر کر آنکھ کہے تم آنکھیں ہیں نرگس کی پھٹی — دہنِ غنچۂ نو دے منہ کہ ہے غنچہ منہ پھٹ
چوری چوری چھپی رُخ میں جو آ جائے نگاہ — زُلفِ مشکیں کی رسن باندھ کے مشکیں جھٹ پٹ
وصف لکھے لبِ شیریں کا جو کوئی کاتب — صفحے سے صفحہ عذوبت کے سبب جاتے لپٹ
آرزو مہر کو مشرق سے نکل کر ہر صبح — کہیں جوشن کی طرح جاؤں میں بازو سے لپٹ
غرض اس شکل کو معشوقہ کیا جس کا بیاں — نظر آئی تو عجب جی کو ہوئی للچاہٹ
شوقِ دل نے یہ کہا تب ہے یہ سروِ سہی — عشق پیچے کی طرح جائیے مستی میں لپٹ

ہاتھ دامن پہ پڑا تھا کہ وہ پیچھے سرکی   سر قدم تک بھی نہ پہنچا کہ گئی دور وہ ہٹ ،
چوٹ سی دل پہ لگی ہاتھ گیا جب خالی   ناز بالے سے نہیں کم وہ پڑی تیغ جو پٹ
ہنس کے ظاہر میں کہا واہ رہی ٹھنڈی گرمی   آپ ہی لطف و کرم آپ ہی یہ جھنجھلاہٹ
چپ رہی پہلے کہا تو یہ کہا دیر کے بعد   تھی ملاقات کہاں کی کہ یہ تیزی جھٹ پٹ
ہوش میں آؤ ذرا خیر ہے کیسا ہے مزاج   خفقاں سے تو طبیعت میں نہیں گھبراہٹ
میں وہ ہوں جس کی ہوس میں ہیں ہزاروں نامی   سینکڑوں مر گئے تھی جن کو مرے نام کی رٹ
مرغِ دل سینکڑوں شہبازِ نظر کے ہیں شکار   خال وہ زاغ سیہ ہے کہ کلیجے گئے چٹ
ہند سے روم تلک بجتے کہ ہیں شہزادے   صبح تا شام ہے ان کا مرے در پہ جمگھٹ
پاؤں کتنوں کے گھسے مثل سبو سر پھوڑے   بادۂ وصل کی پائی نہ کسی نے تلچھٹ
ناطقہ خانۂ دولت ہے مرا نام صفت   ہیں مکیں ہوں تو مکاں جاتے زر و سیم سے پٹ
ملہمِ غیب نے بھیجا تو میں آئی ترے پاس   ہو گراں تجھ کو جو آنا ابھی جاؤں میں پلٹ ،
وصف تو کرتا ہے جس کا میں اسی کی ہوں صفت   دیکھ اعضا کو ذرا پردۂ غفلت کو الٹ
رائے انور سے اسی کی مری آنکھوں میں ہے نور   خلق اس کا مرے گیسو میں ہے خوشبو کی لپٹ
صفِ مژگاں سے عیاں پنجۂ پرزور کی شکل   عزم اس کا مری شاہین نگہ کی ہے جھپٹ
اس کی جو راستی طبع وہی قد میرا   دامنِ فیض کا لٹکاؤ مری زلف کی لٹ
مصحف رخ کو جو دیکھو تو نمایاں وہی شان   کعبۂ دل کو جو دیکھو تو اسی کی چوکھٹ
کون وہ کلب علیخان بہادر جم جاہ   دیتے ہیں جس کو ملک عالم بالا کی رپٹ
عالم خلق نے تحصیل کی خوشبو کی لپٹ   کر لیا سالمے گلستان کا علاقہ کورٹ
کیا شگفتہ ہے بہارِ چمن نزہت طبع   سامنے جھکتے گل و لالہ ہیں کوڑا کر کٹ
واہ کیا قصرِ حکومت ہے رفیع اور وسیع   جھکتے دروازے کے ہیں جرأت و ہمت دو پٹ
شیخ سید مغل افغان ہیں فراہم ہر صبح   کعبہ ان چاروں مصلوں سے ہے اس کی چوکھٹ

لیلۃ القدر رکھا اب نام قصیدے کا امیر — کہہ دے خامے سے کہ مصروفِ دُعا ہو جھٹ پٹ
ملک و دولت کی ترقی ہو الٰہی ہر روز — سجدہ گہ سارے زمانے کی بنے یہ چوکھٹ
حل ہوں ممدوح کے ہاتھوں سے مہماتِ جہاں — درِ دولت پہ رہے اہلِ غرض کا جمگھٹ
نفس جو چند مری زیست کے باقی ہوں ابھی — انہیں قدموں کے تلے جائیں بڑے لطف سے کٹ

قصیدہ (امیر مینائی)

در مدح نواب کلب علی خان والیٔ رامپور (کل شعر ۱۱۶)

فصلِ گل آئی ہوا گلزار رشکِ بوستاں — بڑھ کے رضواں سے ہے ان روزوں ہر باغ باغباں
ہر طرف گلہائے رنگارنگ گلشن میں کھلے — جیسے صبحِ عید یکجا ہوں حسینانِ جہاں
خم نہیں شاخیں درختوں کی ہوا سے خاک پر — کر رہے ہیں سجدۂ شکرِ خدا اِنس و جاں
قم باذن اللہ کہتی آئی گلشن میں بہار — جی اُٹھے جو سو گئے تھے مُردہ دل وقتِ خزاں
جھوم کر آیا ہے ابرِ کوہساری باغ میں — رقص میں ہیں ہر روش طاؤس ہو کر شادماں
لالہ کہتا ہے کہاں موسیٰ ہیں آکر دیکھ لیں — صاف جلوہ ہے چراغِ طور کا مجھ سے عیاں
جھومنا مستوں کی صورت ہے درختوں کا بجا — نکہتِ گل میں بھی ہے کیفِ شرابِ ارغواں
یوں ہے جنبش میں ہوا سے ہر نہالِ سایہ دار — ہو خراماں جس طرح کوئی حسیں داماں کشاں
ہے مبارک فال کوئی ہونے والی ہے خوشی — ہر چراغِ لالہ جوشِ رنگ سے ہے گل فشاں
مومن و کافر سے کہہ دو آئیں سب گلزار میں — عمر کرتے ہیں عبث دیر و حرم میں رائگاں
گرچہ صحنِ باغ میں ہر سال آتی ہے بہار — اور آتا ہے نظر رنگِ زمین و آسماں
ہے سبب اس کا کہ ان روزوں ہوا مسند نشیں — سروِ گلزارِ ریاست صاحبِ بخت و جواں
منبعِ جود و سخاوت معدنِ لطف و کرم — ماہِ اوجِ چرخِ قدرت مہرِ اوجِ کن فکاں
نام نامی وہ کہ ہے سب کے نگینِ دل پہ نقش — نامور کلب علی خان بہادر نوجواں
اس کے وصفِ پاک لکھا دل نے ارادہ جب کیا — بے تکلف آ گیا مطلع یہ بالائے زباں

شش جہت میں ہے جو یہ خورشیدِ یکتائے جہاں — گرد پھر پھر کر فدا ہوتے ہیں ساتوں آسماں
اے خوشا وہ سرزمیں جا بیں جہاں رکھے اُنکے قدم — اے خوشا کشور پھرے جس کی طرف اسکی عناں
مرحبا اُس کو جو صبح و شام ہے اُس کا مطیع — آفریں اُس کو جو روز و شب ہے اس کا مدح خواں
فی الحقیقت ختم ہے اُس پر رعایا پروری — واقعی ایسا شہ لطفیں کا کہاں ہے قدر داں
کلک قدرت نے کوئی کھینچی نہیں ایسی شبیہ — گرکہ تصویریں ہزاروں ہیں مرقع ہے جہاں
آنکھ نرگس سرو قد رخسار گل غنچہ دہن — یہ وہ گلشن ہے کہ خود جس کا خدا ہے باغباں
تاکجا طولِ سخن اب ہے مناسب اختصار — کس سے ہو سکتا ہے اوصافِ مجلّیٰ کا بیاں
جب تلک روشن رہیں افلاک پر خورشید و ماہ — جب تلک گردش کرے بدلے زمین و آسماں
جب تلک ہو سنگ سے پیدا آتش یاقوت و لعل — جب تلک شاخوں سے غنچے گل ہوں غنچوں سے عیاں
نخلِ گل احباب تیرے اس چمن میں سرخ رو — رنگ دشمن زرد یارب صورتِ بادِ خزاں

نواب مرزا خان داغ ۱۸۳۱ء میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ شعر و شاعری کا ذوق جبلی تھا۔ خداداد ذوق کی وجہ سے تھوڑے ہی دنوں میں ریختہ کا شاعر ہو گئے —— داغ بیحد ذہین اور قادر الکلام تھے، سخنوری میں باکمال تھے —— ۱۸۵۷ء تک دلّی دربار سے وابستہ رہے غدر کے بعد نواب یوسف علیخان والیٔ رام پور کے پاس چلے آئے۔ نواب کلب علیخان کے زمانے میں امیر مینائی کے ساتھ ساتھ انہیں بھی بہت شہرت حاصل ہوئی۔ داغ نے اپنی عمر کے ۲۴ سال موخر الذکر نواب کی ملازمت میں گزارے۔ —— اور نواب ہی کے ساتھ فریضہ حج ادا کیا —— نواب کلب علیخان کی موت کے بعد ۱۸۸۸ء میں آپ حیدرآباد (دکن) چلے گئے۔ اور وہاں "مقرب السلطان" بلبلِ ہندوستان جہاں استاد ناظم یار جنگ دبیر الدولہ فصیح الملک" کا خطاب پایا۔ داغ نے یہیں وفات پائی اور یہیں سپردِ خاک ہوئے —— اسی لئے تو علامہ اقبال نے کہا ہے ——

تھی نہ شاید کچھ کشش ایسی وطن کی خاک میں
وہ مہ کامل ہوا پنہاں دکن کی خاک میں

داغ کے چار دیوان غزلیات پر مشتمل ہیں —— ایک مثنوی موسوم بہ فریاد داغ ہے۔ ان کے علاوہ چند قصیدے ہیں جو نظام حیدرآباد اور نواب رامپور کی تعریف میں کہے گئے ہیں۔

داغ خوش طبع، رنگین مزاج، بذلہ سنج اور ہنس مکھ تھے۔ غزلوں سے لگاؤ تھا لیکن درباروں کے سبب سے قصیدہ سرائی بھی کرنی پڑی —— ان کے کہے ہوئے صرف ۴-۵ قصیدے ہیں۔ ان کی زبان میں فصاحت اور سادگی ہے۔ بیانیہ انداز شوخی اور بانکپن سمیٹے ہوتے ہے —— اور اسی وجہ سے وہ اپنے معاصرین امیر، جلال، تسلیم وغیرہ سے زیادہ مقبول ہوئے۔

قصائد میں داغ کوئی خاص مقام حاصل نہ کر سکے —— سودا اور ذوق کی قربات ہی کیا، امیر مینائی کے قصائد کو بھی نہیں پہنچے —— لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ داغ نے قصیدے، فن سے ہٹ کر کہے ہیں —— قطعاً نہیں —— داغ عاشقانہ شاعری کے مسلم الثبوت استاد ہیں —— غزل ان کا خاص میدان ہے —— پھر بھی —— ان کے قصیدوں سے روانی، اور بے ساختگی ٹپکتی ہے۔ اور بعض جگہ نئے نئے مضامین بھی پیدا کئے ہیں —— نظام دکن میر محبوب علی خان کی تعریف میں جو قصیدہ کہا ہے —— مشہور ہے۔

ہم ہوئے یا دیے یا طرف ملک دکن
سرمۂ چشم غزالاں ہوئی گرد دامن

تمہید میں نئے مضامین دیکھئے

نازنینوں کی کمر بید کی شاخ لرزاں
موجۂ ریگ رواں زلف پریشاں کی شکن

بستر قاقم و سنجاب بنا سبزۂ دشت
بخیۂ مخمل و کمخواب ہر اک خشت کہن
خار صحرا اسے انگلی کے اشارے سے بتائے
راہ بھولے جو مسافر کوئی آوارہ وطن
شجر طور کی مانند منور ہر نخل
مل گیا کیا کہیں اس دشت سے وسعت ایمن

اسی طرح داغ نے دلکش اور موثر تشبیہات و استعارات کو بھی برتا ہے اور قصیدے میں بھی جمال بھرا ہے۔

لالہ و گل نے جو پہنی ہے قبائے رنگین،
دیتی ہے خلعت نوروز بہار گلشن
قلقل شیشہ کی آواز ہے لب تا ان بستان
توبہ سے یہ تقاضا ہے کہ تشکن تشکن

گریز اور مدح میں بھی استادانہ رنگ ہے۔ مدح انتہائی زور دار ہے شان و شوکت کی دھوم دھام، تازگی کی آن بان، فدا داری کا طنطنہ ——— اور سلاست و سادگی کا اعجاز ہے۔ روانی اور عمدگی بھی قابل ستائش ہے۔

داغ کا یہ قصیدہ فن اور پختگی کا بہترین نمونہ ہے۔
داغ کی قصیدہ گوئی اور ان کے فن سے انکار عبث ہے۔

نمونہ کلام (داغ)

قصیدہ در مدح نواب محبوب علی خان بہادر نظام الملک آصف جاہ خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ،
(کل شعر ۹۹)

بن ہوا با صبا پیما طرف ملک دکن   سرمۂ چشم غزالاں ہوئی گرد دامن

نازنینوں کی کمر بید کی شاخ لرزاں!
بستر قاقم و سنجاب بنا سبزۂ دشت
قطرۂ شبنم ہر خار سے گوہر بے آب
شاخ آہو پہ گماں پیچ و خم کاکل کا
ذرّے ذرّے سے نمودار فروغ انجم
دیکھے کوسوں سے مسافر کہ یہ آئی منزل
خاک اس دشت میں اڑتی ہے کہ اڑتا ہے عبیر
قوت نامیہ اس جوش پہ اللہ اللہ
چوکڑی بھولے جو اس دشت کی سونگھے خوشبو
خار صحرا اسے انگلی کے اشارے سے بتائے
دیدۂ غول بیاباں نے جلائی مشعل:
زندہ رہتا ہے تن عابد مرتاض کی شکل
شجر طور کی مانند منور ہے شجر
آسماں سبز قدم ہو کے بنا سبز اختر
ندیاں کوہ کی ہیں رشک وہ جوئے شیر
موجیں کرتی ہوئی پھرتی ہے صبا مثل نسیم
حوریں پانی بھریں پنگھٹ کا جو دیکھیں جمگھٹ
ایسے جھرمٹ کیے باہم ہیں ثریا تمثال،
اشہب خامۂ چالاک کی پھرتی ہے عنان
قوت باصرہ و شامہ دنگ کرے ہو نوید!!

موجۂ ریگ رواں زلف پریشاں شکن
تکیۂ مخمل و کمخواب ہر اک خشت کہن
زرد رو لالۂ کہسار سے ہر لعل یمن،
سبزہ دشت میں ہے سبزۂ نوخط کی پھبن،
جا دے جاٹے سے عیاں کاہکشاں کا جوبن
صبح صادق کی طرح شام غریبی روشن
آ گئے اس خاک کے مٹی اثر خشک خلق
دانہ موتی کا جو بوئیں تو ہو خرمن خرمن
کہ یہاں آہوئے تاتار کا ہو نشہ ہرن
راہ بھولے جو مسافر کوئی آوارہ وطن،
ہر بگولے سے عیاں رقص بت نسریں تن
خشک ہو کر بھی بیاباں میں یہاں نخل کہن
مل گیا گر کہیں اس دشت سے دست ایمن
عکس افگن جو ہوا سبزۂ کہسار و دمن
جن سے پھیکی پڑی فردوس کی بھی ہریالی
لہلہاتے ہوئے سبزہ کا نرالا جوبن:
ہے اس انداز کا ہر ایک بت سیمیں تن
کہ زمیں پر نظر آنے لگے پروین و پرن
صنعت دشت و جبل سے طرف شہر و چمن
باغ کی مدح میں گل کھلتے ہیں گلشن گلشن

مطلعِ ثانی

وہ طراوت کا اثر ہے کہ دمِ سیرِ چمن ؛ | پانی دینے لگے یوسف کا یہاں چاہِ ذقن
برگ برگِ گل و گلزار یہاں تک پھیلا | جس سے کوتاہ ہے گلچیں کا سراسر دامن
لالہ و گل نے جو پہنی ہے قبائے رنگیں | دیتی ہے خلعتِ نوروزِ بہارِ گلشن،
قلقلِ شیشہ کی آواز ہے بستان بستان | توبہ مے پہ تقاضا ہے کہ بشکن بشکن
تو عروسانِ چمن مست ہوئے ہیں کب کا | کھینچتی ہے کمرِ سرو کی بھی شاخِ سمن،
وہ رطوبت کا اثر ہے کہ چمن میں خورشید | گوہرِ شبنمِ شاداب سے بھر لے دامن
بوئیے تخمِ محبت کو تو پیدا ہو وفا | ڈالیے پرتوِ رخ کو تو اُگے سیبِ ذقن
لائے گر فصلِ خزاں کو فلکِ نیلی رنگ | نیل پیل ہو غضب دیکھ کے اس کو سوسن
چر پر دانہ جھلے پھولوں کا پھب ایسا | کہ مٹے شمع کی بھی دِل کی لگن دِل کی جلن
کیا عجب پہنچے وہاں تک اثرِ فیضِ بہار | فلسِ ماہی بھی کھلیں صورتِ گل ہائے چمن
گر یونہی فصلِ بہاری کو رہا جوشِ عروج | شاخِ طوبیٰ میں عجب کیا ہے کھلے نسترن
کس طرح دست خطائی نہ کرے نخلِ چنار | تیغِ اردی سے بہا کرتا ہے خونِ بہمن
شہر اس شہر کا ہے نام یہی بلدہ ہے | فخرِ کلکتہ و مدراس نظیرِ لندن
ثانیِ خلدِ ارم بانیِ تزئین و حشم | روکشِ چین و ختن غیرتِ بغداد و عدن
چھپ گئے سقفِ فلک یوں تہِ ایوانِ بلند | نشتری ڈھانک دے جس طرح کوئی زیرِ لگن
روشنی ایسی جواہر کی دکانوں میں عیاں | جس کے نظارے سے ہو چشمِ تمنا روشن
ایسے عشرت کدے ہیں کیوں نہ ہو خلقت دل شاد | ایسے مامن میں نہ کیوں کر ہو زمانہ ایمن
شحنۂ عدل کا وہ خوف ہے بازاروں میں | نہیں ممکن کہ جو برتن سے بھی کھڑکے برتن
ہاتھ باندھے ہوئے پھرتے ہیں یہاں دست دراز | لب سئے رہتے ہیں بیہودہ سرا وقتِ سخن
ذی خرد اتنے ہیں ذی فہم ہیں اتنے کہ یہاں | کیا قباحت ہے اگر ما کی جگہ بولے من

ناظم و ناثر و فرزانہ و دانا و ادیب　　عالم و عاقل و علامہ ہر اک ماہرِ فن
حیدرآباد کا بجتا ہے جہاں میں ڈنکا　　نوبتیں کیوں نہ بجیں دھوم سے باون باون
طفلِ مکتب بھی پڑھاتا ہے فلاطون کو سبق　　خلق ہوتا نہیں اس شہر میں کوئی کودن
حیدرآباد سے کیوں جائے کہیں عیشِ ابد　　خوشتر از ملکِ سلیماں نہ ہو کیوں حبِّ وطن
دشت و کوہ و چمن و شہر کی مداحی سے　　ایسی تشبیب کو زیبا ہے کہیں چار چمن
چمن آرائے دکن خسرو فیض و جواد　　جس نے شاداب کیا آبِ کرم سے یہ چمن
مدح میں اس کی پڑھوں مطلعِ رنگیں ایسا　　جس سے اے داغ ہو شرمندہ بہارِ گلشن،

مطلعِ ثالث

خسروِ تیر فگن تیغ فگن شیر فگن　　میر محبوب علی خاں ملکِ ملکِ دکن
دادگر داد دِہ و داد رس و داد رساں　　فخرِ دیں فخرِ نگیں فخرِ زماں فخرِ زمن
پاک دل پاک نفس پاک نظر پاک نہاد　　نیک خو نیک سیر نیک روش نیک چلن
قدرداں قدر کن و قدر فزا قدر شناس　　حاکمِ علم و عمل بادشہِ فہم و فطن
آفتابِ شرف و اوجِ مہ و عزّ و علا　　شمعِ کاشانۂ دیں اخترِ بختِ روشن
قاطعِ بغض و حسد قامعِ بیداد و ستم　　بانیِ عیش و طرب ماحیِ آلام و حزن
مجمعِ جود و سخا مصدرِ الطاف و عطا　　معدنِ علم و حیا مخزنِ اوصافِ حسن
صاحبِ جاہ و حشم وارثِ دیہیم و سریر　　مالکِ سیف و قلم ظلِّ قدیرِ ذو المنن
تیرے انوار کا پرتو ہے کہ ہے پرتوِ مہر　　تیرے اخلاق کی خوشبو ہے کہ خوشبوئے چمن
ہاتھ ڈالا ہے محالات میں بخشش نے تری　　کہہ سکے کون عطا کو ترے ممکن ممکن
وہ گہربار ترا دستِ کرم ہے شاہا　　آگئے اس فیض کے پانی بھر بھادوں کی بھرن
ہُن برستی ہے دکن میں یہ مثل ہے مشہور　　تو نے برسائے گہرِ فیض سے معدن معدن
فیض ہے کوہ و بیاباں کو بھی ہنگام شمار　　لیتے ہیں لعل و گہر دونوں پھیلا کر دامن

کوئی سختی کرے اس عہد میں کیا ممکن ہے
موم سے بڑھ کے ہوا نرم مزاج آہن،

عہد میں تیرے بجز جو معدوم ہے کیا ہے یہ ہے
کاوشِ کینہ و آزار و غم و رنج و محن

جو و سلطاں سے وہ ممنوع ہوئے طرزِ سوال
زخم پھیلاتے جو دامن تو بنے تر دامن،

وہ بھی چھپ چھپ کے یہاں دیکھتا ہے اپنی موت
زخم میں ٹانکے ہیں یا درد کے در پہ چلمن

حکمت آموز فلاطوں سے تری عقلِ سلیم
بات پختہ ہے تری رائے تری مستحسن

آتشِ قہر سے گر شبنم کا بھی ہو زہرہ آب
شمع کی طرح سے گھل جائے تن روئیں تن

تیرے مداح ہیں سب اہلِ نظر اہلِ کمال
آنکھ میں گھر ہے ترا تو ہے زباں پہ مسکن

سو زباں میں گلِ صد برگ سے لے قرض ہزار
تو کرے لاکھ طرح سے وہ تری مدح سخن

ہیں ترے عہدِ عدالت میں شکستہ احوال
دل شکن، عہد شکن، توبہ شکن، روزہ شکن

بُت کدوں میں ہے یہ ماتم تری دینداری سے
بانگ ناقوس پہ ہوتا ہے لقینِ شیون

جھڑیاں پڑ گئیں آخر کو رخِ توبہ پہ
یعنی اُس کو سمجھتے ہیں جو تھے توبہ شکن

منہ چڑھے کون تری تیغ کے یہ کوہ شگاف
سر شکن، صف شکن، آہن شکن، البرز شکن

ایک ہی وار میں تلوار کرے دو ٹکڑے
مغفر و بکتر و چار آئینہ خفتان جوشن

آئی حال ترے اعدا کو سبکدوشی ہے
تری تلوار اڑا دیتی ہے تن سے گردن

تعریفِ اسپ

کیا ترے اسپ پری وش کی کروں میں تعریف
خوب ہے خوب خوش اسلوب برابر ہمہ تن

سینہ چوڑا ہے نلی چوڑی ہے سُم چوڑے ہیں
جتنی چھوٹی ہے کمر اُتنی بڑی ہے گردن

بال، دم، پاؤں، شکم، کان، کنوتی، پٹھے
ڈھل گئے حسن کے سانچے میں سب اعضائے بدن

جست میں برق ہے اڑنے میں پری گشت میں چرخ
پھر بیکرو صفتِ بوئے بہار گلشن

نہ بندھے اسپ فلک سیر فلک سے ہرگز
گر بنے قوس و قزح اُس کی پچھاڑی کی رسن

اللہ اللہ رے اس تیز روی کی تاثیر
نام لے اُس کا تو ہو صاف زبانِ الکن

اتنی سرعت سے نہ ہرگز خبر آتی جاتی — تار برقی میں ہے آمیزشِ نعلِ توسن

صفتِ فیل

فلک آسا وہ ترا پیل کہ جس کے آگے — ریزۂ سنگ و خزف سے ہیں سبک کوہ و دمن
ہیں ترے فیل کے دانتوں پہ سنہری چھڑے — یا سرِ طور پہ کافور کی شمعیں روشن
یوں سرِ فیلِ سیہ زرد عماری تاباں — شب کو جس طرح سے ہو چرخ پہ مہ جلوہ فگن
ڈر کے رکھتا ہے قدم برج اسد میں خورشید — دیکھ کر فیل شکاری کو ترے شیر فگن
طمطراق اور تری فوج کا وہ زرق و برق — لیس ہر طرح سے ہر ایک رسالہ پلٹن،
دکنی و عربی، کابلی و پنجابی و — ہر سپاہی ترے لشکر کا ہے رشکِ ثرن
داغ مداح و ثنا خوان و ستائش پیرا، — اس دعا پر تری کرتا ہے بس اب ختم سخن
جب تک انداز پہ ہے حسن و جمالِ دلکش — جب تک اظہار پہ ہے رنگِ گل و نسترن
جب تک آفاق میں ہو دولت و ثروت کی نمود — جب تک افلاک پہ ہوں اختر و انجم روشن
جب تک آوازۂ اقبال ہو آویزۂ گوش — جب تک اندازۂ عشرت ہو نہ اندازِ سخن
جب تک انجام کو پہنچے فلکِ پیر کی عمر — جب تک آفت سے ہوں محفوظ زمین اور زمن
جب تک اسلام کا ہے نام جہاں میں قائم — جب تک اس نام سے آباد ہے یہ دارِ کہن
بلبلیں شیفتہ جب تک ہوں بہارِ گل پر — اور پروانہ نثارِ سرِ شمعِ روشن؛
حسنِ معشوق میں جب تک ہو کمالِ تاثیر — دلِ عاشق میں کھبی جاتی ہے تیکھی چتون
تو سلامت رہے آباد رہے شاد رہے — زار ہو خوار ہو ناچار ہو تیرا دشمن
تیری اولاد کی کثرت ہو تری نسل سے یوں — جیسے اک دانہ سے پیدا ہوں ہزاروں خرمن

سرخ رو داغ ہو یوں لطف و کرم سے تیرے
پرتوِ مہر سے جس طرح بنے لعلِ یمن

متاخرین میں محسن کاکوروی بھی امتیازی شان رکھتے ہیں۔ متقی پرہیزگار

امیر مینائی کے ممتاز شاگردوں میں تھے ـــــ محسن دبستان لکھنؤ سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کا رنگ لکھنؤ کے عام رنگ سے جدا ہے۔ "لکھنویت" کی بجائے ان کے کلام میں مذہبیت طہارت اور خلوص کے جیتے جیتے نمونے ہیں۔

محسن کی انفرادی شان اور ان کا اپنا ایک خاص رنگ ہے ـــــ عادت واطوار منزّہ ہیں۔ شعروشاعری، سخن، سراسر دل وذہن کی غمازی کرتی ہے ـــــ اور یہی وجہ ہے کہ محسن کا دل ودماغ پگھل کر ان کے کلام میں منجمد ہو گیا ہے۔

محسن کا گوروی کو شروع ہی سے "نعت" سے والہانہ لگاؤ تھا اور اس پر مفتون تھے ـــــ اور یہ اس جنون کا سبب ہے کہ ان کے دل کی معصوم گھاٹیوں سے پاکیزہ روح، ایک نقرئی، اور شفاف ندی کی مانند پھوٹ بہی ہے۔ گلدستہ رحمت (قصیدہ) کی ہی مثال لے لیجئے۔ سولہ سال کی بالی عمر میں ہی مذہبیت اور شاعرانہ ذوق وفن آپس میں کس قدر گھلے ملے دکھائی دیتے ہیں۔

متذکرہ قصیدہ کا مطلع ہے

پھر بہار آئی کہ ہونے لگے صحرا گلشن
غنچہ ہے نام خدا نافۂ آہوئے ختن

اس کے بعض اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔ ـــــ

جملہ انبتہ اللہ نباتاً حسناً

ان دنوں فصل بہاری میں ہے طغرائے چمن
رشک شمشاد اگا کرتے ہیں نخلِ قامت
سرو گلزار زمیں پہ جو ہوا سایہ فگن
خطِ گلزار ہوا جس نے کہا خط غبار
ہو گیا کاغذ مکتوب زمینِ گلشن

دوسرا مطلع یہ ہے۔

ہاں میں مفتوں ہوں اسی رشک چمن کا کہ چمن
جس کی صورت سے سدا خار ندامت در تن
اس کو بیجا ہے گلستاں کا مشبہ کہنا
کہیئے کیسے کہ وہ ہے لالہ رخ و نسرین تن

تمام قصیدہ فنی خوبیوں سے آراستہ ہے۔ اور اس چھوٹی سی عمر کا یہ شعور اور شعر آفرینی کا بے پناہ جذبہ، ان کی برتری اور روح کی پاکیزگی کا زندہ ثبوت ہے۔

جب ہم محسن کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نعت (جو ایک قسم کا قصیدہ ہی ہے) کی طہارت بھری فضا کی پہنائیوں میں انہوں نے جی بھر کے پرواز کی ہے۔ اور کٹھن سے کٹھن مرحلوں میں بھی، انہوں نے اپنی والہانہ اڑان کو برقرار رکھا ہے۔

ان کے کلام میں ہندی اور اسلامی فکر کا ایک نو بہ نو اور حسین امتزاج ہے۔ حلاوت اور نمکینیت کا وہ اٹوٹ اور پرجمال رشتہ ہے کہ روح تک جھوم جھوم جاتی ہے۔ اور اسے ایک قسم کا سکون اور طمانیت میسر آتی ہے۔

محسن کے کلام کی روح ابتذال، نسائیت اور رکاکت سے ملوث نہیں۔ ان کے یہاں تو جذبات کے دفینے ہیں۔ اور ان کا کلام خلوص، داخلیت اور جذبات کی شدت کاری کی ابدی اور غیر فانی بنیادوں پر استوار ہے —— طہارت، خلوص جذبہ اور شگفتگی، محسن کی زیست کے اجالے ہیں اور انہیں اجالوں کو سمیٹ کر انہوں نے ایک یونانی ماہر فن کی طرح اپنی شاعری کا "صنم" تراشا ہے —— اور یہ ان ہی باتوں کا فیض ہے کہ اس میں صوری و معنوی دلکشیاں اور رعنائیاں پائی جاتی ہیں —— اس اعتبار سے محسن کاکوروی لکھنوی شعرا میں ایک ارفع مقام رکھتے ہیں۔

قصیدہ گوئی اور صلہ کی یافت، لازم و ملزوم ہیں۔ انعام کا لالچ قصیدہ سنج کو تصنع، ابتذال اور غلو کی طرف مائل کرتا ہے اور پھر اسے قصیدہ کی سجاوٹ اور آرائش کی خاطر "خارجیت" پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ من کی دنیا تیاگ کر ادھر ادھر سے رنگ مستعار لینے پڑتے ہیں۔ اور اس طرح خلوص حقیقت اور سچائی کا آبگینہ چٹخ کر اپنا حسن کھو بیٹھتا ہے۔ تاثر آفرینی کی سبھی قدریں ماند پڑ جاتی ہیں۔

محسن نے اس صنف کو صلہ کی خاطر نہیں اپنایا، یہ تو ان کے دل بلکہ ان کی روح کی پکار تھی۔ وہ اپنے جنون، ذوق، بے پناہ جذبے اور خلوص محبت کی بنا پر مدح کی طرف جھکتے ہیں —— ان کی نعتوں میں ان کے جذبات کا شدید جوار بھاٹا ہے۔ جو ان کی سچائی و صداقت اور شاعرانہ انداز بیان کے ساتھ تال میل کھا کر انہیں سراپا کیف میں ڈبو دیتا ہے۔

ان کا نعتیہ کلام ضخامت کے لحاظ سے زیادہ نہیں لیکن وزن اور وقعت کی رو سے نمایاں ہے —— حسن فن، رعنائی شوق، مخلصانہ محبت، تہذیب، متانت، شائستگی، عذوبت، احساس اور جذبہ ان کے کلام کے انگ انگ سے مترشح ہے۔ طہارت اور پوترتا کی برستی گھٹاؤں کی تمام تر روپہلی دھاروں نے انہیں نکھارا ہے۔

ان کا کلام متوازن ہے۔ اس میں ہمواری و استواری ہے۔ شادابی شگفتگی کی ہریالی اور طراوت ہے۔ رفعت مضمون کی شوخیاں ہیں۔ فکر کی طراریاں ہیں۔ تخیل کی نیرنگیاں ہیں۔ بادبہاری کے سحر آفریں اور نکہت بیز جھونکے ہیں۔ زبان آسمان سی شفاف ہے جیسے فردوس میں بہنے والی نہروں کی پرسکون موجوں کو الفاظ کی صورت دے دی گئی ہے، جیسے چاندنی سے تقدس اور دلوں کی دھڑکنوں سے موسیقی نچوڑ کر انہیں بخش دی گئی ہے۔

جاذبیت اور دلآویزی کی نکھری دھوپ، ان کی تشبیہوں اور استعاروں کے

رسجل رخساروں پر بہت ہی بھلی لگتی ہے — بعینہٖ ان کے ہاں تلمیحات نور اور رس رچی بسی ہوتی ہیں۔

محسن نے یہ تشبیہیں، استعارے اور تلمیحات، عربی فارسی سے اخذ نہیں کیں اور نہ ہی اردو شاعروں کی قطعاً متابعت کی ہے --- بلکہ یہ تو ہند کی سانولی سلونی فضاؤں کی خاص پیداوار ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کا نیاپن، ان کی نگینیت، ان کی شیرینی، لطف وکیف میں اضافہ کر دیتی ہے۔

محسن کے ہاں جزالت، سلاست، برجستگی، بے ساختگی، بھرم، متانت، منزگی، جوش بیان بہاؤ، بیلے سجیلے اور مترنم الفاظ کا انتخاب اور چناؤ، تخیل کی گونا گونی اور فنی پرکھ اس قدر ہے کہ ان کی دھوپیں دیکھ کر قصیدہ کا اپنا دل دھڑک اٹھا ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اردو زبان اور ادب پر محسن کے بہت احسانات ہیں۔ انہوں نے اپنے فن، اپنی سوجھ بوجھ اور اپنی صلاحیت کی خوبصورتیاں اور سجاوٹیں نعت (قصیدہ) کے مقدس ہیکل پر قربان کر کے رکھ دی ہیں ——— توصیف وتعریف خود ان کی محتاج ہے۔

ادب میں نعت گوئی کوئی نئی چیز نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ محسن سے پیشتر اردو کسی شاعر نے اسے مستقل فن کی حیثیت سے اختیار نہیں کیا، اور نہ ہی اسے پرجمال بنانے میں اضطراب اور بے چینیوں کا مظاہرہ کیا۔ محسن ہی وہ پہلے شاعر ہیں کہ جنہوں نے اپنی مساعی جمیلہ اور سعی حمیدہ سے نعت کو گل وگلزار بنایا ہے اور اس میں توانائی، نئے پن اور نغمہ انگیزی کی کھیتیاں لہلہاتی ہیں۔

انہوں نے نعت میں تسلسل اور تواتر کو برقرار رکھا ہے اور قصیدے کے چاروں ارکان کے جمالیاتی نظام کی تعظیم وتکریم کی ہے۔ باہر سے رنگ نہیں سمیٹے، دل و ذہن سے بہاریں کھینچ کر قصیدہ کا تن من سجایا ہے۔ انگ انگ کی تزئین کی ہے۔ قرآن

اور حدیث سے فیض اٹھایا ہے۔ اور اس طرح "یگیت اور اسلامیت" "ہندوانیت اور مذہبیت" کو یکجا کر رہا ہے۔ یکجا بھی اس طرح کہ دونوں گلے ملتے دکھائی دیتے ہیں ——— لیکن اس کے باوجود تطہیر کو پیش نظر رکھا ہے ——— اور موضوع کی ہر طور توقیر کی ہے۔

ان کی مثنویوں، "صبح تجلی، اور "چراغ کعبہ" میں بھی قصیدہ کا سا مزہ ہے۔ ایک ناتمام عشقیہ مثنوی نگارستانِ اُلفت ہے ——— ایک اور مثنوی "فغان حسن" کے عنوان سے ہے مثنویوں کے علاوہ سراپائے رسُول اکرم صلعم (مسدس) مخمس نعتیہ اور قصیدہ بعنوان، "چتر شہنشاہی"، واجد علی شاہ کی تعریف میں لکھا ہے ——— چند قطعات تاریخ بھی ان کی نوک قلم کے رہین منت ہیں۔

"سراپائے رسُول اکرم صلعم" کی تمہید کے دو بند

للہ الحمد شب غم نے اٹھایا بستر
مرحبا طالع بیدار مبارک ہو سحر
مژدہ اے دل کہ ہوا نورِ خدا پیش نظر
بارک اللہ جمعیت کا ہے رنگ دیگر
گر نہ ہو پاس ادب تو مجھے کچھ دعویٰ ہے
سجدہ کرتے ہیں ملائک مرا وہ رتبہ ہے
آج کس دھوم سے خدام سخن آتے ہیں
مسند فکر کی محفل میں بچھا جاتے ہیں؛
تنگئ بزم جہاں دیکھ کے گھبراتے ہیں
گاؤ تکیہ کرہ ارض کا اٹھواتے ہیں
جشن کا روز ہے معنی کے شہ اقدس کا

اور اونچا کرو خیمہ فلک اطلس کا

اس مسدس کا زور شور آخر تک نہیں ٹوٹتا ——— نعت کی بہاریں دیکھئے۔

یہ وہ صورت ہے کہ دیکھی نہ سنی ایسی کبھی
تھی یہی شکل مقدس کہ ازل میں جو کھنچی
ناز سے خامۂ قدرت نے کیا واہ رے میں
اور تصویر یہ بول اٹھی کہ اللہ رے میں

اس کے بعد پورا سراپا پیش کیا ہے۔ فکر کی جہانبانیاں ہیں ——— اور دلکشی و رعنائی اپنے پورے سحر کے ساتھ جلوہ گر ہے ——— تشبیہیں اور تمثیلیں، معجز بیانیوں سے اعجاز بن کر رہ گئی ہیں۔

بند دوست آ چکا ہے یا کوئی خمسے کا بند
طبع استاد ازل بھی ہے عجب نازک بند
انگلی ہر ایک ہے وہ مصرع موزون و بلند
انگلی رکھ سکتے نہیں جس پہ کہیں دانشمند،
مجھ کو فخر صفت پنجۂ اقدس بس ہے
اس مسدس کے شرف کو یہ مخمس بس ہے

محسن کے نعتیہ قصیدوں میں سب سے مشہور قصیدہ "مدیح خیر المرسلین" ہے۔ یہ نعتیہ قصیدہ ۱۸۷۶ء میں لکھا گیا تھا اور اردو قصیدہ گوئی کے لئے باعث افتخار ہے۔ اس قصیدے کی جس قدر خوبیاں اور محاسن بیان کئے جائیں، کم ہیں، قصیدہ گو نے اپنی سحر بیانیوں اور شاعرانہ طرازیوں سے اسکو نئی دلہن کا سا سنگار بخش دیا ہے۔ جو دل میں نئی امنگیں اور نئی دھڑکنیں لئے، آرسی میں اپنا معصوم اور حسین مکھڑا دیکھ دیکھ کر شرما رہی ہے۔

یہ نعتیہ قصیدہ شروع سے آخر تک نغمگی سے معمور ہے۔ الفاظ کی صناعیاں، حلاوت و شیرینی کی روانیاں اور نئے نئے مضامین کی کارگردیوں میں ایک نہ ٹوٹنے والا بہاؤ ہے اس قصیدے کی سب سے بڑی خوبی اسلامی تصوف اور ہندیت کا سنجوگ ہے۔

یہ قصیدہ شاعر کی قادرالکلامی کی غمازی کرتا ہے۔

اس لامیہ (نعتیہ) قصیدہ کا مطلع یہ ہے۔

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

تمہید میں ہندو مت کے لحاظ سے مختلف مضامین پیدا کئے ہیں —— اور تمہید کو آگے بڑھایا ہے۔ اس کے بعد تشبیب میں متھرا، گوکل، بتوں کا محل، برہمن، سری کرشن، گنگا اور گوپیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ کئی حضرات نے اس پر اعتراضات کئے ہیں، کہ نعت رسُول مبارک کے سلسلے میں ایسی باتیں نہیں آنی چاہئیں —— لیکن ان کا یہ اعتراض کچھ صحیح دکھائی نہیں دیتا —— قصیدے میں تشبیب کے مضامین کی قید نہیں۔ اور پھر تشبیب میں تو باتیں ہی شباب اور عشق کی ہوتی ہیں۔ لوگوں نے طرح طرح کے مضامین پیش کئے ہیں۔ پھر بھی شاعر نے اس اعتراض کا جواب گریز کے مضمون میں خود ہی دے دیا ہے۔ بہر حال قصیدہ اپنی تمام تر ضیا پاشیوں سے منوّر ہے۔ اور اس کا ایک ایک شعر ترشا ہوا نگینہ ہے —— جس کی دلپذیری من موہ لیتی ہے۔ مدح اور قصیدہ کا اختتام بھی، اولین ارکان کی طرح شاعرانہ صلاحیتوں، نادر اور نازک تشبیہوں، استعاروں، علمی تجلیوں اور رس بھرے الفاظ سے مزیّن ہے —— یہی قصیدہ ہم نمونہ کے طور پر یہاں پیش کرتے ہیں۔ خود ہی اس کی رعنائیوں کا اندازہ لگا لیجئے۔

لامیہ قصیدہ (نعتیہ) کل اشعار ۱۴۳ (مندرجہ ۷۳)

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

گھر میں اشنان کریں سرو قدانِ گوکل
جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طولِ امل

خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی
کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل

کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی
ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل

جانب قبلہ ہوئی ہے یورش ابر سیاہ
کہیں پھر کعبے پہ قبضہ نہ کریں لات و ہبل

تھر کا نرسا جپہ ہے برق لئے جل میں آگ
ابر چوٹی کا برہمن ہے لئے آگ میں جل

ابر پنجاب طلاطم میں ہے اعلیٰ ناظم
برق بنگالۂ ظلمت میں گورنر جنرل

نہ کھلا آٹھ پہر میں کبھی دو چار گھڑی
پندرہ روز ہوئے پانی کو منگل منگل

دیکھیے ہوگا سری کرشن کا کیونکر درشن
سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بیکل

راکھیاں لے کے سلونوں کی برہمن نکلے
تار بارش کا تو ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل

اب کے میلہ تھا ہنڈولے کا بھی گرداب بلا،
نہ بچا کوئی محافہ نہ کوئی رتھ نہ بہل

ڈوبتے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے
نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل

تہ و بالا کئے دیتے ہیں ہوا کے جھونکے
بیڑے بھادوں کے نکلتے ہیں بجا کر گنگا جل

کبھی ڈوبی کبھی اچھلی مہِ نو کی کشتی
بحرِ اخضر میں طلاطم ہے پڑی ہے ہل چل

قمریاں کہتی ہیں طوبیٰ سے مزاجِ عالی،
لالۂ باغ سے منہ دیکھے فلک تبسم کش

شب دیجور اندھیرے میں ہے بادل کے نہاں
لیلیٰ محمل میں ہے ڈالے ہوئے منہ پر آنچل

شاہدِ فکر ہے مکھڑے سے اٹھائے گھونگھٹ
چشم کافر ہیں لگائے ہوئے کافر کاجل

جوگیا بھیس کئے چرخ لگائے ہے بھبھوت
یا کہ بیراگی ہے پربت پہ بچھائے کمبل

شب کو مہتاب نظر آئے نہ دن کو خورشید
ہے یہ اندھیر مچائے ہوئے تاثیر زحل

وہ دھواں دھار گھٹا ہے کہ نظر آئے نہ شمع
گر چہ پروانہ بھی ڈھونڈے لئے بکف مشعل

نور کی تیلی ہوئی پردۂ ظلمت میں نہاں   چشمِ خورشید جہانبیں میں ہیں آثارِ سبل
آتشِ گل کا دھواں بامِ فلک تک پہنچا   جم گیا منزلِ خورشید کی چھت میں کاجل
ابر بھی چل نہیں سکتا وہ اندھیرا گھپ ہے   برق سے رعد یہ کہتا ہے کہ لانا مشعل
جس طرف سے گئی بجلی پھر ادھر آ نہ سکی   قلعۂ چرخ میں ہے بھول بھلیاں بادل
آج یہ نشو و نما کا ہے ستارہ چمکا   شاخ میں کاہکشاں کی نکل آئی کونپل
دیکھتے دیکھتے بڑھ جاتی ہے گلشن کی بہار   دیدۂ نرگسِ شہلا کو نہ سمجھو احول
خضر فرماتے ہیں سنبل سے تری عمر دراز   پھول سے کہتے ہیں پھلتا رہے گلزارِ امل
جگنو پھرتے ہیں جو گلبن میں تو آتی ہے نظر   مصحفِ گل کے حواشی پہ طلائی جدول
جس طرف دیکھیے بیلے کی کھلی ہیں کلیاں   لوگ کہتے ہیں کہ کرتے ہیں فرنگی کونسل
آہِ قمری میں مزا اور مزے میں تاثیر   سرو میں دیکھیے پھول آنے لگے پھول میں پھل
شاخ میں پھول ہیں جنبش میں زمیں پر سنبل   سب ہوا کرتے ہیں گلشن میں سوار و پیدل
شجرے میں مغاں کے نکل آئیں شاخیں   حرمتِ دخترِ رز میں نظر آتا ہے خلل
سبزۂ خط سے ہوا ہونے لگی سرخیٔ لب   چمنِ حسن سے لال اڑ گئے بن کر ہریل
صاف آمادۂ پرواز ہے شاہاں کی طرح   پر لگائے ہوئے مژگانِ صنم کا کاجل
دیکھتا گر کہیں محسن کی فغان و زاری   نہ گرجتا کبھی ایسا نہ برستا بادل

مطلع

پھر چلا خامہ قصیدے کی طرف بعد غزل   کہ ہے چکر میں سخن گو کا دماغ مختل
باغ میں ابرِ سیہ مست چڑھا کر آیا   جامِ خورشید ہے میکدۂ برجِ حمل
چشمِ میکش میں گلابی ہے کہ پھولا ہے گلاب   پھول کیوڑے کا کھلا ہے کہ کھلی ہے بوتل
جام کے بادہ سے کہتے ہیں کہ زندوں کو نہ چھیڑ   دستِ بے جام سے کہتے ہیں کہ ہاتھوں کو نہ مل
گوہرِ دل کو بڑی سنگدلی سے پیسا   کشتی لے کر بنایا مرے ساقی نے کھرل

کیسی افسردگی کیا بات ہے مرجھانے کی
غنچہ کہتا ہے صبا تو سے کہ گلشن سے نکل

صبر میں وحشت کی مصروف ہے جو بادلہ رنگ
شغل میں چاک گریباں کے ہے جو ہاتھ ہے شل

مصر والوں کو یہ ڈر ہے کہ زلیخا کے لئے
سر بازار نہ بکنے لگے سودے کا خلل

ہے سخن گو کو نہ انشا کی نہ املا کی خبر
ہو گئی نظم کی انشا و خبر سب مہمل

دل میں کچھ اور ہے پر منہ سے نکلتا ہے کچھ اور
لفظ بے معنی ہیں اور معنی ہیں سب بے اٹکل

کتنا بے قید ہوا اک نغذر آوارہ پھرا
کوئی مندر نہ بچا اس سے نہ کوئی استھل

کبھی گنگا پہ بھٹکتا ہے کبھی جمنا پر
گھاگھرا پہ کبھی گزرا کبھی سوئے چمل

چھینٹے دینے سے نہ چھوڑا ہے قلزم و نیل
نہ بچا خاک اڑانے سے کوئی دشت و جبل

ہاں یہ سچ ہے کہ طبیعت نے اڑایا جو غبار
ہوئی آئینہ مضموں کی وہ چنداں صیقل

دستِ معنی بے بہکنے ہیں بھی اعلیٰ کی طرف
تاکتا ہے تو ثریا کی سنہری بوتل

اک ذرا دیکھئے کیفیت معراج سخن
ہاتھ میں جام زحل شیشۂ مے زیر بغل

گرتے پڑتے ہوئے مستانہ کہاں رکھا پاؤں
کہ تصور بھی وہاں جا نہ سکے سر کے بل

یعنی اس نور کے میدان میں پہنچا کہ جہاں
خرمن برق تجلی کا لقب ہے بادل

تار باران مسلسل ہے ملائک کا درود
پئے تسبیح خداوند جہاں عز و جل

کہیں طوبیٰ کہیں کوثر کہیں فردوس بریں
کہیں بہتی ہوئی نہر لبن و نہر عسل

کہیں جبریل حکومت پہ کہیں اسرافیل
کہیں رضواں کا کہیں ساقی کوثر کا عمل

کنز مخفی کے کسی سمت نہاں تہ خانے
اک طرف مظہر قدرت کا عیاں شیش محل

عاشق جلوۂ طلبگار کہیں چشم قبول،
ناز معشوق کے پردے میں کہیں حسن عمل

گل بیرنگی مطلق سے لہکتے گلزار!
بے نیازی کی ریاحیں سے مہکتے جنگل

باغ تنزیہہ میں سرسبز نہال تشبیہ!
انبیا جس کی ہیں شاخیں عرفا کونپل!

گل خوش رنگ رسول مدنی العربی!
زیب دامان ابد طرۂ دستار ازل

نہ کوئی اس کا مشابہ ہے نہ ہمسر نہ نظیر — نہ کوئی اس کا مماثل نہ مقابل نہ بدل !
اوج رفعت کا قمر نخل دو عالم کا ثمر — بحر وحدت کا گہر چشمۂ کثرت کا کنول
مہر توحید کی ضو اوج شرف کا مہ نو — شمع ایجاد کی لو بزم رسالت کا کنول
مرجع روح امیں زیب دہ عرش بریں — حامی دین متیں ناسخ ادیان و ملل
ہفت اقلیم ولایت میں شہ عالی جاہ — چار اطراف ہدایت میں نبی مرسل
جی میں آتا ہے لکھوں مطلع برجستہ اگر — وجد میں آکے قلم ہاتھ سے جاتے نہ نکل

مطلع

منتخب نسخۂ وحدت کا تھا یہ روز ازل — کہ نہ احمد کا ہے ثانی نہ احد کا اول
سب سے اعلیٰ تری سرکار ہے سب سے افضل — میرے ایمان مفصل کا یہی ہے مجمل
ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیری خالی — نہ مرا شعر نہ قطعہ نہ قصیدہ نہ غزل
دین و دنیا میں کسی کا نہ سہارا ہو مجھے — صرف تیرا ہو بھروسہ تیری قوت ترا بل
صف محشر میں ترے ساتھ ہو تیرا مداح — ہاتھ میں ہو یہی مستانہ قصیدہ یہ غزل
کہیں جبریل اشارے سے کہ ہاں بسم اللہ — سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

قصیدہ در مدح واجد علی شاہ بادشاہ اودھ (کل بارہ بند)

عزیز مصر جب تک مشتری ہو مہر قیصر ہو — قمر پرویز زہرہ مثل شیریں نازپرور ہو
دبیر چرخ توقیعات میں کسریٰ کا ہمسر ہو — ہو کیواں مثل کے مریخ بہرام دلاور ہو
الٰہی جان عالم بادشاہ ہفت کشور ہو
فلک پر سات اختر ہیں زمیں پر ایک اختر ہو

ہو جب تک شاخ میں گل گل میں نکہت نکہت میں جوبن — لبوں پر نے ہو نے میں نغمہ ہو نغمہ میں دل بستن
بغل میں شیشہ ہو شیشے میں مے سر میں شور انگن — ہو دل پہلو میں دل میں ماہرو ماہرو میں الہڑپن

تری محفل میں دورِ عیش ہم پیمانِ ساغر ہو
مے و محبوب ہو مطرب ہو ساقی ہو گلِ تر ہو

رہے جبتک بکامِ تشنہ کاماں سمت باری   رہے برسات میں ہر جا رسو چھائی ہوئی بدلی
متاعِ کاروانِ ابر گوہر بار ہو پانی   کنوئیں میں آبِ شیریں ہو بجائے یوسفِ مصری
ترا فیض اے سحابِ مرحمت ہر دم فزوں تر ہو
کنواں ہو نہر ہو گنگا ہو قلزم ہو سمندر ہو

رہو جبتک ہمیں دل اور دل میں درد اور درد میں زاری   تہہ ابرو ہو آنکھ اور آنکھ میں اشکِ الم جاری
ہو پانی تیغ میں پانی میں زہر اور زہر ہو کاری   ہو غش سکتے میں غش میں بیخودی اور بیخودی طاری
ترے دشمن کو دنیا میں نہ آسائش میسر ہو
ہمیشہ کشتہ و خستہ سراسیمہ ہو مضطر ہو

تسنیم فیض آباد کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ لکھنؤ کی پلٹن میں رہے۔ ۱۰۲ برس کی عمر میں لکھنؤ میں (۱۹۱۸ء) میں وفات پائی۔ غزلیات کے چار پانچ دیوان ہیں۔ مثنویاں بھی بہت سی لکھیں۔ قصائد بھی کافی تعداد میں ہیں —— ان کے کلام میں پختگی ہے۔ مضامین دلکشی لئے ہوئے ہیں —— اور الفاظ میں رنگینیاں مستور ہیں۔

قدر بلگرامی بھی اسی دور کے شاعر ہیں۔ وطن بلگرام ہے۔ ۱۲۴۹ھ میں داغ سے تقریباً تین سال بعد پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی کی استعداد رکھتے تھے۔ واجد علی شاہ، کے عہد میں لکھنؤ گئے اور شعر و سخن کا آغاز کیا۔ مختلف علوم و فنون میں مہارت حاصل کی۔ ریاضی سنسکرت، عروض وغیرہ میں مہارت رکھتے تھے۔ وہ اپنی ایک رباعی میں استادوں کے نام گنواتے ہیں۔ غالب کا نام بھی لیا ہے۔

سیکھے سحر و برق سے بندش کے بند پھر غالب و بحر نے بتائے پیوند!
مجھ سا بھی زمانے میں نہ ہوگا اسے قدر بدنام کنندۂ نکو نامے چند

قدر بلگرامی حیدرآباد جاکر نظام کے ہاں ملازم ہوگئے تھے۔ ان کے کلیات میں ہر قسم کا کلام موجود ہے۔ قصائد کی تعداد سات ہے۔ آصف جاہ دکن ان کے ممدوح تھے۔

قدر بلگرامی کی شاعری میں شادابی ہے۔ اچھے شاعر تھے۔ گو قصائد کہنے والوں میں ان کا مرتبہ بہت بلند نہیں پھر بھی ان کے قصیدوں میں قصیدہ گوئی کا فن بخوبی موجود ہے جتنے قصیدے کہے ہیں محاسن اور خوبیاں بدرجہ احسن رکھتے ہیں۔ ان میں تسلسل بھی ہے طوالت بھی ہے۔ دوسری پابندیوں کا احترام بھی کیا ہے۔ قصیدہ میں تشبیب و تمہید کے مضامین میں ان کا فن خوب ہی دکھتا ہے۔ اور یہ تشبیب کے بادشاہ ہیں۔ انہوں نے جو بھی تشبیب لکھی لاجواب لکھی دل بادل والے قصیدے میں سودا کے بعد بہت سوں نے اس طرح میں طبع آزمائی ہے۔ قدر بلگرامی بھی ان میں سے ایک ہیں۔ قدر بلگرامی کے اس قصیدے میں ۲۳۰ شعر ہیں اور انہوں نے انتہائی خوش اسلوبی سے اس قصیدے کو اختتام تک پہنچایا ہے۔ اور اپنی قابلیت اور صلاحیت کے ثبوت مہیا کئے ہیں فکر کی اڑان، اور الفاظ کے چناؤ میں کافی محنت سے کام لیا ہے۔ تشبیہات، استعارات وغیرہ میں شوخی جدت اور تیکھا پن ہے۔ ظاہری و باطنی محاسن، نئی ترکیبیں اور چست بندشیں، نئے نئے مضامین کی بہتات، تعمق یہ سب باتیں ان کے قصیدوں کی زینت بنی ہوئی ہیں —— حیدرآباد کی ستائش میں بھی خوب کہا ہے۔

قصیدے کے چاروں ارکان ان کے ہاں سجے سجائے نظر آتے ہیں قصیدہ کے لئے ان کی طبیعت انتہائی موزوں و مناسب تھی اور یہی وجہ ہے کہ ان کا قلم دلسری

اصناف کے مقابلے میں، قصائد میں زیادہ رواں ہے۔ ۱۳۰۱ھ (۲۹ ستمبر ۱۸۸۴ء) میں انھوں نے وفات پائی اور لکھنؤ میں دفن ہوئے۔

(نمونۂ کلام) قدر بلگرامی

قصیدہ بہاریہ (ممدوح آصف جاہ دکن) کل اشعار ۲۳۰

باغ پر آج گھٹا ٹوپ اٹھا ہے بادل
خسرو بادِ بہاری کا کھچا دل بادل

ابر خیمہ ہے تو بوندیں ہیں طنابِ خیمہ
چوب خیمہ کے دھنک سبزہ ہے فرش مخمل

جھک پڑی کالی گھٹا دن ہوا برسات کی رات
سب کو ہر پھر کے دکھاتی ہے یہ بجلی مشعل

باغ میں چاروں طرف آگ لگا دی گل نے
سبز جھاڑوں میں ہیں گلستاں میں چڑھے پھول

یوں شرار ابر میں بارانِ بہاری سے سرد
جیسے چوٹی کے شوالے میں چڑھے گنگا جل

ابر پہ یوں نظر آتا ہے خم قوس قزح
جس طرح سینۂ معشوق پہ آڑی ہیکل

مکہ مسجد نظر آتی ہے کہ بیت المعمور
چار مینار ہیں یا عرش کی ساقوں کے چل

حیدرآباد ہے اونچا فلک چارم سے
حبذا قدرت و صناعی صناع ازل،

ہے وہ خورشید علم اس فلک چارم پر
جس کا ہر خاک پہ ہے دھوپ کی مانند عمل

مہر گستر فلک ملک کا بادشا خاور
ذرہ پرور کرم و مہر میں اک ضرب مثل

شاہ محبوب علی بادشہ ملک دکن
خود اول لام جہاں ظلِ خدائے عز و جل

اس قصیدے کا جو آئینہ مجوب ہے نام
نذر دیدو یہی سرکار کو تم پہلے پہل

شعر گنتے جو ہوں منظور تو کیا مشکل ہے
حیدرآباد کے اعداد گنیں اہل جمل

حالی نئی شاعری کی تحریک بانی اور قومی شاعری کے نقیب ہیں ان کا انداز تحریر سادہ و سلیس ہے۔ وہ زبان سے زیادہ مطلب پر توجہ دیتے ہیں۔ آرائش بیان اور

تزئین کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں۔ خلوص، سچائی، تہذیب اور متانت ان کے کلام کی روح ہے۔ تکلف، تصنع اور آورد سے بیزار ہیں۔

حالی قصیدہ گو نہیں تھے۔ اور نہ ہی ان کے ہاں قصیدہ کی سی پیچ وخم غلو اور تصنع ہے۔ لیکن پھر بھی انہوں نے جو دو چار قصیدے کہے ہیں ان کا نمونہ ہم یہاں پیش کر دیتے ہیں۔

نمونۂ کلام (حالی)

تہنیت عید الفطر بہ جناب نواب سر آسمان جاہ مدار المہام سرکار عالی (۱۳۰۶ھ)

مہِ صیام گیا اور روزِ عید آیا!
خوشی کا عید کی حق ہر کوئی بجا لایا

کیا خدا کا ادا شکر روزہ داروں نے
کہ اپنے صبر کا انعام ہم نے بھر پایا

رہینِ منتِ ساقی ہیں بادہ خوار تمام
کہ تیس روز کے پیاسوں کا روزہ کھلوایا

گئے ہیں ایسے مساجد سے معتکف خوش خوش
کہ جیسے طفل ہو مکتب سے چھوٹ کر آیا

شگفتہ آتے ہیں اس طرح عید گاہ سے لوگ
کہ گنج انہوں نے ہے گویا خرابہ میں پایا

حسین چاؤ میں پھولے نہیں سماتے آج
کہ دن خدا نے نمائش کا اُن کو دکھلایا

عزیز دوست گلے ملتے پھرتے ہیں باہم
خدا نے سینکڑوں روٹھوں کو آج منوایا

حکیم ہیں متفکر نہ زاہد افسردہ!
خوشی نے دی ہے زمانے کی کچھ پلٹ کایا

غنی ہیں شال میں مست اور گدا ہیں کمال میں مست
ہے ایک خوان سے منعم نے سب کو چکھوایا

ادھر ہے فصل بہار اور ادھر ہے عید الفطر
سماں نشاط کا ہے شہر و دشت پر چھایا

کھلے ہیں اس کے عوض دشت میں کروڑوں پھول
جو غم سے شہر میں آج ایک دل ہے کملایا

ہزاروں سرو خراماں ہیں شہر میں ہر سو
جو دشت میں کوئی پودا ہے آج مرجھایا

اگر خوشی کا زمانے کی ہے یہی عالم
تو سمجھو غم کا عوض غمزدوں نے بھر پایا

مگر یہ عاریتی انبساط ہے سب ہیچ
اس انبساط پہ غافل ہے جو کہ اترایا،

فریفتہ ہوئے جو ایسی ایسی خوشیوں پر
انہوں نے آب کا دھوکا سراب پر پایا

خوشی ہے جس سے عبارت وہ ہے خوشی ان کی
جنہوں نے خلق میں ذکرِ جمیل پھیلایا

جنہوں نے دین کے گرتے ستون کو تھاما
جنہوں نے علم کا بجھتا چراغ اُکسایا

جنہوں نے ملک کے امراض کو کیا تشخیص
جنہوں نے قوم کے افسردہ دل کو گرمایا

جنہوں نے خلق سے اپنا بنایا غیروں کو
جنہوں نے لطف سے وحشی دلوں کو پرچایا

خبر مریضوں کی لی جاہلوں کو دی تعلیم
کھلایا بھوکوں کو بے پوششوں کو پہنایا

ہوا زمین پہ جس سال آسماں ممسک
مینہ اپنی داد و دہش کا انہوں نے برسایا

ہوائے دہر اگر ہو گئی کبھی فاسد
فضائے دہر کو خلقِ حسن سے مہکایا

سدا غریبوں کی امداد پر ہیں جو تیار
لیا سنبھال اُسے جس نے ہاتھ پکڑایا

ہمیشہ مانگنے والوں کو بے دریغ دیا
نہ مانگ سکتے تھے جو ان کے گھر بھی پہنچایا

نہ سمجھا آپ کو اک پاسبان سے بڑھ کر
انہوں نے لطفِ حکومت اسی میں کچھ پایا

نہ پائی کھانے میں لذت نہ چین سے سوئے
ستم رسیدہ کا جب تک کہ حق نہ دلوایا

وغا میں شیر مگر وقتِ رحم مورِ ضعیف
کسی کی آہ سنی اور دل ان کا بھر آیا

وہ سمجھے یہ کہ کوئی فتنہ ہو آتا راج
جو شاہراہ میں پتا کسی نے کھڑکایا

جو چونک اُٹھے کہ گویا قیامت آ پہنچی
جو در پہ آ کے کوئی دادخواہ چلایا

نشاطِ حسرت جاوید کی ہے اُنکو نوید
دل ایسا جن کو عنایت خدا نے فرمایا

سنا تھا کان سے جو ذکرِ خیرِ عہدِ سلف
سو آنکھ سے وہ وزیرِ دکن نے دکھلایا

بشیرِ دولت و دیں صدرِ اعظم امراء
نہیں ہے جس کا کوئی قربِ شہ میں ہم پایا

جو ظلِ حق ہے رعیت کے سر پہ شاہِ دکن
تو اعظم الامرا ظلِ حق کا ہے سایہ

ہمیشہ جس کو ہے بہبودِ ملک مدِ نظر
رفاہ و امن ممالک میں جس نے پھیلایا

اٹھایا فتنہ نے جب سر، فرو کیا اسکو
پڑا عمل میں جہاں عقدہ اس کو سلجھایا

بنائے نظم و نسق جس نے رکھی شوریٰ پر　　مشیرِ کارِ خسروِ پروردوں کو بٹھایا
دکن کو جس نے کیا مرجعِ خواص و عوام　　دکن کا جس نے کہ ڈنکا جہاں میں بجوایا
نہ کوئی ملک میں سرکش رہا نہ نافرمان　　جفا و ظلم کو توڑا غرور کو ڈھایا
بلِ انتظام کے رشتے میں پڑ رہے تھے بہت　　سو تکلے کی طرح ایک ایک بل نکلوایا
لگا گئے تھے وزیرانِ رفتہ جو پودا　　وہ صاحبی میں وزیرِ زماں کی پھل لایا
ترقی اب یہ تمدن میں کی ہے بلدہ نے　　کہ اپنی حالتِ پیشیں سے خود ہے شرمایا
زبانِ حال سے ماضی کو دیجیے کیا نسبت　　اندھیری چھائی ہوئی تھی کہ دن نکل آیا
خدا دراز کرے عمرِ اعظم الامرا　　دکن کو جس کی حکومت نے دن یہ دکھلایا
زمیں پہ سایۂ فلک جب تک آسماں ہے　　رہے دکن پہ حضورِ نظام کا سایا
تھی کوئی چیز نہ حالیؔ کے پاس لائقِ نذر　　سو یہ چکامۂ ناچیز پیشکش لایا

یہی بس اس کے لئے ہوگا مایۂ نازش
جو اعظم الامرا نے قبول فرمایا

داستان اور افسانہ

جب تک انسان باقی ہے، اس کی نسل باقی ہے
کہانی باقی ہے جب اس مادی دنیا کے آخری
انسان کی قبر بنے گی تو اس کے قریب ہی کہانی کا
مزار بھی کھڑا ہو جائے گا۔

کہانی سننے اور سنانے کا شوق بہت ہی پُرانا ہے، اتنا پُرانا جتنا کہ انسان خود، یوں معلوم ہوتا ہے کہ جب قدرت نے انسان کے وجود کو تراشا، تو اس کے سینے کے ایک غیر مرئی معبد میں، چپکے سے داستان اور قصے کی دیوی کو بٹھلا دیا۔

جس طرح آگ اور پانی کے اس جہان کا گوشہ گوشہ داستان اور کہانیوں سے معمور ہے۔ کیا خبر اوپر کی دنیا بھی داستان سرائی کی چکا چوند سے منوّر ہو —— کہکشاں کے راستوں میں حوریں کہانی سناتی ہوں۔ چاند، تاروں کے عقب میں آسمان کے نیلگوں کلس پہ فرشتے داستان تراشی کرتے ہوں —— فردوس کے رنگ و روپ سے مملو گوشے ان ترانوں سے گونجتے ہوں۔ اور جہنم کے سلگتے ہوئے کناروں کے شعلوں میں بھی فسانے کے رنگ جھلکتے ہوں۔

مغرب، مغرب ہے۔ اور مشرق، مشرق۔ داستان اور کہانی کے ضمن میں یہ کہنا قطعاً بے جا ہے —— داستان، پربت پربت، نگر نگر، ڈگر ڈگر گھومی ہے۔ اس نے کسی مخصوص خطے اور کسی خاص گوشے میں جنم نہیں لیا بلکہ جہاں ممتا اور پیار بھری آغوش پائی۔ وہیں ہمکنے لگی۔

مغرب کے حسین و جمیل ساحل ہوں یا افریقہ کے تیرہ و تار گھنے جنگل

ہند و پاک کی سبز اور سنہری فصل کو جنم دینے والی دھرتی ہو یا جاپان کی آگ اور انگار سے اگلنے والی سرزمین، ٹنڈرا کے برودت زدہ میدان ہوں یا گوبی کے بے آب و گیاہ، وشت و صحرا ہر جگہ داستان زار، مسکراتے دکھائی دیں گے —— رچرڈ برٹن کے الفاظ میں "کہانیاں ساری دنیا کو پیاری ہیں"۔

غرضیکہ اس جہان کا ہر جیتا جاگتا خطہ کہانیوں کے ساز و سنگیت سے گونج رہا ہے اور گونجتا رہے گا —— جب تک انسان باقی ہے، اس کی نسل باقی ہے، یہ گیت ہونٹوں کے نرم گوشوں سے پھوٹتے ہی رہیں گے —— رستے ہی رہیں گے —— اور جب اس مادی دنیا کے آخری انسان کی قبر بنے گی تو اس کے پاس ہی داستان کا مزار بھی کھڑا ہو جائے گا۔

کسی ملک کے قدیم ترین قصوں میں نظر ڈالئے تو موضوع کے لحاظ سے ان میں ایک ہی قسم کی مشابہت ملے گی —— غیر معمولی واقعات، خونی حادثات، رزم و بزم، دہشت و ہیبت، اسرار و رموز، جادو ٹونے، بھوت پریت، دیو پریاں، عدت، عشق، اور عجیب و غریب مخلوق یہ سب باتیں ان کی اساس ہیں۔

اگر ہم کہانیوں کی ابتدا اور تاریخ کا صحیح اندازہ لیں تو ہمیں تہذیب کے آغاز تک پہنچنا ہوگا —— بقول حکمائے یونان "قصہ گوئی، شاعری اور موسیقی کی دیویوں سے بھی قدیم تر ہے"۔

جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا کے جنگلوں میں ایسے افسانے رائج ہیں جو آج سے دس ہزار سال پہلے سنے اور سنائے گئے تھے۔ ہم اس مضمون میں، انہیں قصوں سے ابتدا کرتے ہیں جو اس وقت موجود ہیں، اور جن کی قدامت کی دلیل ہمیں میسر ہے۔

دنیا کی تہذیبوں میں، سب سے پرانی اور قدیم مصر کی تہذیب ہے۔ اور اسی ماحول میں سب سے پہلے فن تحریر کی تخلیق ہوئی —— فن تحریر، مصر کے

اولین حکمران خاندان کے عہد میں ۰۰۰ ۳ ق م میں ایجاد ہوا۔ اور اسی بنا پر، مصر کے حکمران شاہ خافری کے عہد (۰۰ ۵ ق م) کا لکھا ہوا افسانہ موجود ہے جو دنیا کا قدیم ترین افسانہ شمار ہوتا ہے اس افسانے میں بادشاہ بیگم اور غلام کے ناجائز تعلقات کا ذکر ہے۔:

مصر میں ۰۰ ۲۳ ق م سے ۰۰ ۲۲ ق م تک مختصر رومانی کہانیوں کا رواج رہا ہے۔ جن میں سے کشتی شکستہ ملاح اور سنوہا کی کہانیاں مشہور ہیں۔ اوّل الذکر کہانی میں ایک عجیب الخلقت داڑھی والے سنہری اژدہا کا بیان ہے جو آدمی کی طرح بولتا ہے ——— یہ اژدہا، ملاح کو بہت سے تحفے دے کر وداع کرتا ہے۔ دوسری کہانی نیم تاریخی ہے۔

بابل میں ۲۱۲۳ ق م اور ۲۰۸۱ ق م کے درمیان حمورابی مشہور بادشاہ ہو گزرا ہے اس کے عہد میں قبر میں مٹی کی تختیاں رکھ دی جاتی تھیں۔ اس زمانے کی کچھ تختیوں پر جو اس وقت پنسلوینیا یونیورسٹی میں محفوظ ہیں۔ گل گمیش کی کہانی ملتی ہے۔ یہ کہانی بہت طویل ہے اور اس کی زبان بہت ترقی یافتہ ہے ——— اس میں عموں، دیوتاؤں اور زندگی جاوداں بخشنے والے پیڑ وغیرہ کا تذکرہ ہوا ہے۔ اسی زمانے کی دیوی عشتار جسے وینس، ذہرہ، اور افرودیتی بھی کہا جاتا ہے، کی کہانی بھی ملتی ہے۔

بارہویں تیرھویں صدی ق م میں تو مصر کی اکثر کہانیاں دکھائی دیتی ہیں، جن میں سے بیشتر تاریخی رنگ اپنائے ہوتے ہیں۔ اسی طرح فلسطین اور اس کے آس پاس کے مشرقی ریگ زاروں میں ۱۰۰۰ ق م سے بھی قبل، قصہ گوئی اور داستان خوانی باضابطہ صورت اختیار کر چکی تھی، جن میں سے کچھ قصے توریت اور انجیل کے ذریعے زمانے کے بے رحم ہاتھوں کی قطع برید سے بچ کر، رہ گئے ہیں ——— چین کی تاریخ کا آغاز بھی ۱۳۰۰ ق م سے ہوتا ہے۔ اس خطہ کا ایک بہت ہی قدیم اور عمدہ افسانہ ناوَل چین کا "شفتالو کے پھول" ہیں۔

حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو قصہ گوئی کی ابتدا کا سہرا مشرق کے سر ہے۔

رچرڈ برٹن لکھتا ہے۔

" اگر پاکیزہ تخیل کی بعض روایات کو جن میں واقعات ادبی اور فکری نزاکتوں کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ قصہ کہہ سکتے ہیں تو اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ مشرق کے ریگ زاروں میں قصہ سرائی اس وقت باضابطہ صورت اختیار کر چکی تھی۔ جبکہ دنیا ابھی فن تحریر سے واقف بھی نہیں تھی۔"

ہندوستان بھی کہانیوں کی قدامت میں مصر کے سوا کسی ملک سے پیچھے نہیں۔ ویدک ہندوستان کے زمانے سے ہی ہر قسم کی کہانیاں آغاز پذیر ہو چکی تھیں۔ رگ وید۔ برہمن اپنشد اور مہابھارت کی متعدد کہانیاں اس بات کی شاہد ہیں۔

جاتک کی بہت سی کہانیاں مہاتما بدھ سے پہلے کی ہیں۔ جنہیں جاتک کی شکل میں ڈھال دیا گیا ہے جاتک کے بعد سنسکرت کی مشہور کتاب "پنچ تنتر" جو دنیا کی بڑی کتابوں میں سے ہے ـــــ مختلف زبانوں میں جتنے ترجمے اس کے ہوئے ہیں اتنے کسی اور کتاب کے نہیں ہوئے یہی انوار سہیلی کی اصل ہے۔

پنچ تنتر کے بعد برہت کتھا منجری، کتھا سرت ساگر، ہتو پدیش اور ٹنک سپتتی میں بھی جانوروں کی کہانیاں آتی ہیں۔

اب اردو کا آغاز ہوتا ہے۔ زمانے کے آذر نے سنسکرت سے متانت عربی سے بلاغت، فارسی سے فصاحت، انگریزی سے سلاست۔ بھاشا سے شیرینی گجراتی سے لوچ، پنجابی سے گھن گرج اور دکنی سے نکہت اور بانکپن لیا، اور پھر اردو کا حسین اور من بھاتا پیکر تراش کر رکھ دیا۔ بعد ازاں دوسرے فن کاروں نے اس میں سخنوری اور داستان سرائی کے دلکش اور جاذب نظر رنگ بھر کر، اسے حسین سے حسین ترین بنا دیا۔

اُردو زبان میں قصّے کی ابتدا جنوبی ہند دکن سے ہوتی ہے۔ اُردو نثر میں تو قصّے کم ملتے ہیں اور کچھ ایسے اہم بھی نہیں۔ البتہ نظم میں ان کی بہتات ہے — نظم میں جتنی بھی مشہور مثنویاں ہیں وہ سب کی سب پریوں کی دلکش داستان ہیں۔ اکثر قصوں کی روح فارسی زبان سے لی گئی ہے۔

دلکش داستانوں پر مشتمل یہ مثنویاں تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ اس لئے ہم صرف چند نام گنوانے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

اُردو مثنویوں میں سب سے پہلے نظامی نے ۸۶۵ ۔ ۸۶۷ھ میں عاشقانہ مثنوی "کدم راؤ اور پدم راؤ" لکھی۔ اس کے بعد ۱۰۱۸ھ میں وجہی کی عاشقانہ مثنوی "قطب مشتری" وجود میں آئی۔ اس مثنوی میں محمد قلی قطب شاہ اور بنگال کی حکمران بھاگ متی کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے — "قطب مشتری" کے بعد غواصی نے بھی اپنی مشہور مثنوی "سیف الملوک و بدیع الجمال" لکھی — یہ الف لیلہ کی مشہور داستان ہے — اس کے بعد مقیمی نے مثنوی "چندر بدن و ماہ یار" تصنیف کی — جس میں شہر پٹن کی شہزادی چندر بدن اور تاجر زادہ ماہ یار کا قصّہ مشہور ہے۔

چلبر مہر اور گورکی تین مثنویاں، ابن نشاطی کی مثنوی "پھول بن" نصرتی کی مثنوی "گلشن عشق" فائز کی مثنوی "رضوان شاہ و روح افزا" عاجز کی مثنوی "ملکہ مصر" وغیرہ وجود میں آتی ہیں۔

مثنویوں کے علاوہ دکن میں بہت سوں نے کام کندلا، گل صنوبر، سنگھاسن بتیسی، حاتم طائی، چار درویش، لیلےٰ مجنوں، اگروگل، بہار دانش، کام روپ وکام لتا، جنگ امیر حمزہ اور کلیلہ و دمنہ کو نظم کیا یہ سب ۱۲۰۰ھ کے آس پاس لکھی گئیں۔

ان مثنویوں کے بعد اردو کا سرمایہ جنوبی ہند (یعنی دکن) سے شمالی ہند میں منتقل ہوتا ہے۔ اور شعر و شاعری اور اردو نثر کے جواہر ریزے جنم لیتے ہیں۔

اردو نثر کی باقاعدہ ابتدا اور نثری داستانوں کا باقاعدہ آغاز فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے قیام سے ہوتا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کا افتتاح ۴ مئی ۱۸۰۰ء کو عمل میں آیا۔ اس کالج کے فاضل صدر ڈاکٹر جان گل کرسٹ خود اردو زبان کے پروفیسر تھے۔ اور انہیں اس زبان سے خاصی دلچسپی تھی —— اردو زبان کے بیشتر نثری قصے اردو داستانیں اسی کالج کی رہین منت ہیں۔

تعجب ہوتا ہے کہ اردو کے تمام قصے ترجمہ ہیں۔ لے دے کے صرف تین قصے طبع زاد نظر آتے ہیں۔ یہ تینوں ایک سلسلے کے ہیں۔ ان کے علاوہ زیادہ تر فارسی سے ترجمہ ہیں، بعض کی اصل سنسکرت ہے۔ گو اردو میں وہ برج بھاشا یا فارسی کی وساطت سے آئے ہیں۔ بعض عربی زبان سے لئے گئے ہیں۔

سنسکرت سے جو قصے لئے گئے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

کلیلہ و دمنہ کے ترجمے —— طوطا کہانی، بتیال پچیسی، سنگھاسن بتیسی، قصہ مادھونل —— شکنتلا۔ ان میں ابتدائی دو فارسی کے ذریعے آئے ہیں اور بعد کے چار برج بھاشا سے۔

عربی کے ذریعے اردو کی آغوش ان قصوں سے آراستہ ہوتی۔

الف لیلہ کے ترجمے۔ اخوان الصفا

الف لیلہ کے بعض ترجمے انگریزی زبان کی معرفت میسر آئے۔

ان کے علاوہ

"نوطرز مرصع، باغ و بہار، آرائش محفل (حاتم طائی) مذہب عشق، گل صنوبر

شگوفۂ محبت۔ داستان امیر حمزہ، بوستان خیال۔
فارسی سے اردو میں منتقل کئے گئے۔
فسانۂ عجائب۔ سروش سخن اور طلسم حیرت۔ طبع زاد ہیں۔
مندرجہ بالا قصوں اور داستانوں کو ہم یوں ترتیب دے سکتے ہیں۔
کلیلہ و دمنہ۔ طوطا کہانی، بیتال پچیسی۔ سنگھاسن بتیسی اور الف لیلہ کہانیوں کے زمرے میں آتی ہیں۔
باغ و بہار، کیتکی کی کہانی۔ مذہب عشق فسانۂ عجائب۔ گل صنوبر، شگوفۂ محبت، سروش سخن اور طلسم حیرت کو مختصر داستانیں کہہ سکتے ہیں۔
داستان امیر حمزہ اور بوستان خیال طویل داستانیں ہیں جو لاتعداد صفحات پر مشتمل ہیں۔
داستان امیر حمزہ کو اردو کے سب قصوں پر تفوق حاصل ہے۔ اردو کے اس، سب سے طویل قصے میں مترجمین اور مولفین نے اتنی چیزوں کا اضافہ کیا ہے کہ فارسی کے ترجمہ ہونے کی بجائے انہوں نے مستقل تصانیف کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔
اس داستان (امیر حمزہ) کی تالیف و تصنیف کے دو سلسلے ہیں۔ ایک سلسلے کا تعلق فورٹ ولیم کالج میں لکھے جانے والے قصوں میں سے ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں خلیل علی خان اشک نے داستانوں کو چار حصوں میں ترجمہ کر کے اسے ایک جلد میں منتشکل کیا اس داستان کے دوسرے سلسلے کا تعلق ان چھیالیس جلدوں سے ہے، جو نولکشور پریس کے زیر اہتمام مرتب ہوئیں۔ ان جلدوں میں بعض کی حیثیت ترجمہ اور تالیف کی ہے اور بعض خالصتاً تصانیف ہیں۔

داستان کی خصوصیات

"داستان کی خوبی یہ ہے کہ اسے طول دیا جاتا ہے۔ قصہ در قصہ اور ضمنی کہانیوں کے ذریعے

داستان کو پیچیدہ کر دیا جاتا ہے اور اسی میں ان کی دلچسپی اور دلکشی کا راز ہے۔ سننے والوں کو زیادہ سے زیادہ دیر تک انجام کا مشتاق رکھنا ایک فن ہے اصطلاح میں اسے داستان روکنا کہتے ہیں۔

داستانوں کے پلاٹ میں زیادہ تنوع نہیں ملتا۔ ایک فرسودہ طریقہ یہ تھا کہ کسی شہزادے کو خواب میں یا کسی پرندہ کے ذریعہ یہ معلوم ہوا کہ یہاں سے ایک کروڑ کوس پر ایک شہزادی اتنی حسین رہتی ہے کہ چاند اور سورج، دونوں اس کے پرتو ہیں بس پھر کیا تھا شہزادہ اتنا سنتے ہی دیوانہ ہو جاتا ہے اور چل دیتا ہے۔ راستے میں ہر قسم کی بلاؤں اور مصیبتوں کا سامنا کرتا ہے اور آخر میں ان پر فتح پاتا ہوا پیار کی راجدھانی میں پہنچ جاتا ہے ——— شہزادی بھی اسے دیکھتے ہی گھائل ہو جاتی ہے اور پھر گوناگوں مصائب کے بعد ان کی شادی ہو جاتی ہے۔ یا ان داستانوں کا خلاصہ ہم اس طرح کر سکتے ہیں کہ ہیرو کسی مقصود کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ راہ میں مخالف قوتیں حائل ہیں۔ وہ ہمت اور جسارت کا سہارا لے کر ان کے سامنے ڈٹ جاتا ہے اور پھر انہیں نیست و نابود کر کے کامران و کامیاب ہو جاتا ہے۔

نادیدہ محبوب کی تلاش کے موضوعات چہار درویش (باغ و بہار)، گل بکاؤلی فسانۂ عجائب اور بوستان خیال میں ہیں۔

گل صنوبر اور حاتم میں کچھ سوالوں کے جوابات درکار ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ بھی ایک شہزادی کو حاصل کرنے کے لئے ہے ——— حاتم طائی میں یہ سوال اس طرح سے ہیں۔

(۱) ایک بار دیکھا ہے، دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔

(۲) نیکی کر دریا میں ڈال

(۳) کسی سے بدی نہ کر۔ اگر کریگا تو بدلہ پائے گا۔

۴۔ سچ کہنے میں ہمیشہ راحت ہوتی ہے۔
۵۔ کوہ ندا کی خبر لانا
۶۔ اس موتی کا جوڑا تلاش کرنا جو مرغابی کے انڈے کے برابر ہے۔
۷۔ حمام بادگرد کی خبر لانا۔

داستانِ امیر حمزہ اور بوستانِ خیال میں مقصد تو مذہبی ہے لیکن موضوع وہی طلسم، سحر، مار کٹائی۔ بربریت، دہشت، بیاہ، شادیاں۔ غیبی امداد، ہیرو کی کارگزاریاں وغیرہ وغیرہ۔

موضوع کچھ بھی ہو ــــ اشتیاق کے شعلے کی لپک داستان کی اساسی بنیاد ہے۔

داستان میں ہر وہ چیز جو مصنف کے ذہن میں آجائے جائز ہے داستانوں میں ایسے ایسے واقعات بیان ہوتے ہیں کہ انسان انہیں سن کر دنگ رہ جاتا ہے ــــ داستان کی باتیں گو عقل سے ماورئی ہیں لیکن پھر بھی لطف اور مزہ سے تہی نہیں !

طلسم ہوشربا۔ جلد ششم ص۔ ۲۸۰ (داستان امیر حمزہ کی ایک کڑی) افراسیاب شہنشاہ طلسم ہوشربا کی بھانجی ملکہ ارمان جادو آتی ہے۔

"ٹکڑا ابر مروارید ی پیدا ہوا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ اس ابر فرحت افزا کو دیکھ کر گل ہنسے غنچے مسکرائے۔ نخل صحرا وجد میں آئے۔ قمریوں نے کوکو کی صدا دی۔ .... وہ لکہ ابر شق ہوا۔ سب نے دیکھا کہ تخت پر ایک نازنین گلگوں پوش پھولوں کا گہنا پہنے ہوئے دریائے جوھر میں غوطہ زن رشک چمن زلفیں عارض انور پر بل کھا رہی ہیں ...... جس کی نگاہ جمال جہاں آرا پر پڑی آنکھ سے آنکھ لڑی کلیجے پر ہاتھ رکھ لیا تمام اہل لشکر نظارہ کرنے لگے جوانان جشن پرست ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگے مگر

وہ حور طلعت پری پیکر زہرہ جبیں مسکراتی ہوئی گلدستے گرد تخت کے چنے ہوئے قریب افراسیاب کے آکر اتری۔ ..... افراسیاب نے گلے لگا لیا.....“

ارمان، بہار کے مقابلہ پہ آتی ہے۔

”ہنستی ہوئی طاؤس پر سوار ہوتی میدان میں آکر عجائب وغرائب دکھانے لگی۔ جس نخل کے سائے میں آکر ٹھہری وہ نخل جیاب ہو گیا سرسبز و شاداب ہو گیا۔ جس جانب مسکرا کے دیکھتی ہے مہک پھولوں کی آتی ہے۔ طائر پروں کا سر پہ سایہ کیئے ہوئے مثل ستارہ سحری چمک رہے ہیں“۔

بہار، اس کے جادو کے بندھنوں کو توڑ کر اسے پھولوں کی خوشبو سے مست کرتی ہے اور ”دامِ رگِ گل“ میں پھنساتی ہے۔“

اس طرح ملکۂ تاریک شکل کش کو جو افراسیاب شہنشاہ طلسم ہوشربا کی دائی اناں ہوتی ہے۔ جب پتہ چلتا ہے کہ عمرو عیار نے اسے دھوکا دیا ہے اور اسی کے لشکر کے آدمی اسے کھانے کے لئے دیتا رہا ہے تو وہ لشکر اسلام پر بقول مصنف اس طرح ٹوٹتی ہے:“

”تاریک لشکر پر آگری جس کو پکڑا ابھر اٹھا مار کر چیر ڈالا چبانا شروع کیا پامال کرتی ہوئی آتی ہے اگر کسی خیمے کے قریب پہنچی طناب پکڑ کر کہ مار خیمہ گرا گئی۔ سو دب گئے۔ جو کوئی زندہ بچ کے نکلا تاریک نے اسے پکڑ کے چیر ڈالا۔ تمام سرداروں نے جو یہ قیامت برپا دیکھی۔ برق لامع کڑک کر بلند ہوتی وہاں سے تاریک پر گرتی۔ تاریک روسیاہ کو خبر بھی نہ ہوتی صرف ہاتھ ہلا دیا جیسے کوئی مچھر مارتا ہے۔ سب سردار ملکے سحر کر رہے ہیں۔ لیکن تاریک پر تاثیر نہیں ہوتی۔ باغبان نے بڑھ بڑھ کے کیسے کیسے گیند مارے۔ تاریک پر تاثیر نہیں ہوتی برق تڑپ تڑپ کے گر رہی ہے۔ رعد چیخیں مارتا ہے۔ خورشید نے آگ برسائی ملکہ مہرخ نے گولے فولادی قریب جاکر مارے جسم پر

تاریک کے فولادی گولے پڑ رہے ہیں اف بھی نہیں کرتی، ودیائے فوج میں ثناوری کرتی ہوئی جاتی ہے ہزاروں کو چیر پھاڑ کے پھینک دیا ہے۔ بارگاہیں پامال صفیں اجاڑ"۔۔۔!

تاریک کی یہ صفت بھی تبلاتی ہے کہ اس پر کوئی ہتھیار رہ کرتی جادو کارگر نہیں ہوتا۔ وہ خود دھوئیں میں چھپی رہتی ہے، کسی کو نظر نہیں آتی۔ منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکال کر سارے ماحول کو تاریک کر دیتی ہے اور یہ دھواں جس کی آنکھوں کو لگتا ہے اندھا ہو جاتا ہے وہ منہ سے انگارے اگل کر خیمے بھی جلا ڈالتی ہے۔

مہتر قران (عیار) تیغہ نور افشانی سے جب اسی تاریک کو ہلاک کرتا ہے تو "اندھیرا چھا گیا، ساحروں کے دم گھٹنے لگے، ہزارہا زاغ و زغن لعبد رنج و محن درختوں سے اڑے پروں سے سر پیٹ کر ہائے ملکہ تاریک نعرہ کرتے تھے جل جل کر زمین پر گرتے تھے"۔ تمام طلسم ہوشربا میں سوگ منایا گیا۔

(طلسم ہوشربا۔ جلد دوم ص۔ ۲۸۵)

جب آفت شمشیر زن ماری گئی تو نازک چشم اس کا بدلہ لینے کا تہیہ کرتی ہے اور طاؤس پر سوار ہو کر خدا (لقا) کو سجدہ کر کے وسط میدان میں آتی ہے۔

"نازک چشم کو یہ سن کر غصہ آیا اور ایک نارنج سحر پڑھ کر سمت آسمان اچھالا وہ بروشتے ہوا جا کر شق ہوا اور اس میں سے دھواں نکلا باعانت ہوا وہ دھواں مثل ابر لشکر اسلام پر چھا گیا اور تمام لشکر میں تاریکی ہو گئی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ معلوم ہوتا تھا۔ اسی تاریکی میں اس نے اور ایک ناریل مارا کہ پھر ایک لکہ ابر پیدا ہوا اور وہ اس میں سے پتھر اور فولادی گولے برسنے لگے۔ لشکر اسلام میں تہلکہ پڑ گیا ......

شام ہوتے ہی نازک چشم نے رد سحر اپنا کیا اور جہاں روشن ہوا وہ سنگباری کم ہوئی اسے پکار کر نہیب دی کہ اے اسلامیان دیکھا تم نے قدرت خداوند تعالیٰ

کوکہ دن رات ہوگئی تھی اور اگر آج تم نے مشورہ کرکے اطاعت آکر خداوندی کی تو اس سے زیادہ روز سیاہ دیکھو گے"

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جب کوئی ساحر یا ساحرہ نمودار ہوتی ہے تو زلزلوں، طوفان باراں، محض علامتوں کے جلو میں آتی ہے۔ بعینہٖ جب ہلاک ہوتی ہے، تو شورہ شر پیدا ہوتا ہے

ساحر کبھی تنہا نہیں آتے۔ لاکھوں کا لشکر لے کر نکلتے ہیں اور پھر ایسے ایسے جادو، سحر اور واقعات رونما ہوتے ہیں کہ ہماری اس دنیا کا آدمی تو اس ماحول میں ایک سانس بھی نہیں لے سکتا۔ ساحر اپنے لشکریوں میں سے جادوگروں کو یکے بعد دیگرے لڑنے کے لئے میدان میں بھیجتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے گذشتہ جنگوں میں پہلوان، پہلوان کو یا سوار، مخالف سوار کو لڑنے کے لئے للکارا کرتے۔ ساحروں کی یہ جنگیں انتہائی دلچسپ ہوتی ہیں۔ ہومان اور بلور کی لڑائی (طلسم ہوشربا جلد ششم) ملاحظہ فرمائیے۔

"ہومان نے طرف اپنے قلعہ کے دیکھ کر دستک دی۔ سو جوان سیاہ رو تیرہ درون بصورت میمون ترسول ہاتھ میں اچھلتے کودتے نمایاں ہوئے ...... بلور نے مٹھیاں کھولیں۔ پانچ پتلے سنہری آڑی بتیاں باندھے ہوئے چھوٹے چھوٹے پیچھے ہاتھ میں ظاہر ہوئے۔

یہ پتلے جب ہومان کے میمونان کو مارتے ہیں تو ہومان کو غصہ آجاتا ہے۔ "ہومان غصے میں بڑھا خنجر سے ران کو چاک کیا لہو نے جلو میں خون لیا ان پانچوں پتلوں پر پھینک دیا۔ قطرات خون اس رو سیاہ کے شعلہ آتش بن گئے۔ پانچوں پتلے جلنے لگے ـــ"

ہومان کے جادو کا یہ بھی ایک ادنٰے سا کرشمہ ہے۔

"ہوبان مثل رعد گرج رہا ہے ابر سے خون برس رہا ہے جس پر قطرہ خون پڑ گیا۔ جل گیا...... خون برسا کر آئی کسی ہزاروں کو مارا۔"

اور یہ بھی۔

ہوبان گنبد سے پر نکلتا ہے اور زمین پر گولہ مار کر طبقہ زمین کو پھاڑ دیتا ہے۔ اور پھر "دریا جوشان دخروشان میں ہزاروں ملازمان جمشید ڈوبتے ہیں۔"

ایسے میں جمشید فرزند ارجمند کوکب نے رب کارساز سے دعا کی امداچانک برہمن روئین تن مع چند جوانان صف شکن تیغہ آبدار لئے پہنچ گیا۔

"برہمن نے گولہ کمر سے نکال کے اس ابر خونی پر مارا...... وہ ابر پلٹا لشکر ہوبان پر برسنے لگا جس پر وہ قطرہ پڑ گیا جل گیا۔ اس کے بعد دو تین گولے اور برہمن نے مارے جب گولہ پھٹا اس میں سے گولیاں کٹاریاں چھریاں سن سن نکلیں جس کے سینے پر پڑیں۔ پشت کو توڑ کر پار گزر گئیں دو سو گز سے چار سو کے سر پھٹے۔"

ماہیان اور ملکہ مشتری کی لڑائی یوں بیان ہوتی ہے۔

"ماہیان نے پیچھے ہٹ کر ایک گولہ مارا ملکہ مشتری نے سحر پڑھ کر رد کیا...... ...... ماہیان نیمچہ کھینچ کر غصے میں جا پڑی۔ للکارا او ملکہ مشتری آج تمہاری موت خریداری کرے گی بازار قضا گرم ہے۔ مشتری نے بھی نیمچہ کھینچا۔ دونوں میں نیمچہ چلنے لگا۔ شعلے بھڑکے جنگل کے صدہا نخل جلے شیر بھاگے کلاک کے جنگل سے ہاتھیوں نے دیکھا اپنے مقام چھوڑ کر بھاگے مسکن کا خیال نہ رہا۔ شیروں سے کچھار چھوٹے طائر آشیانوں سے اڑے کسی کو آرام نہ تھا...... مشتری کے سحر نے آگ لگا دی ماہیان کے افسوں نے زمین ہلا دی۔ دونوں کامل و اکمل ماہیان رکن طلسم ہوشربا یہ روح رواں طلسم نور افشاں۔"

ان کے علاوہ برہمن روئین تن اور تاریک کی جنگیں، ملک اطلس گلگوں

روشن اور تاریک وافراسیاب کی لڑائیاں عجیب وغریب ہیں۔

(فسانۂ عجائب) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "انجمن آرا کو دیو سرخ پھول سنگھاتا تو انجمن آرا کا تن سر سے جدا ہو کر چھپکے پر چلا جاتا اور تن مسہری پر استراحت کرتا اور سفید پھول سونگھا دیتا تو تن سر سے آ لگتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

داستانوں میں عجیب الخلقت باتوں اور فوق فطرت عناصر کے علاوہ کرداروں کا بے پناہ سمندر ہوتا ہے جس میں موجیں اٹھتی ہیں، اچھلتی ہیں، منہ نوچتی ہیں۔ بے شمار اور ان گنت بھوت پریت، ماہیہ، جادوگر، جادوگرنیاں، دیو دیونیاں، سحر گر، موکل، پتلے، چڑیل، ساحر، ساحرہ، کٹنیاں، بلائیں، اژدہے، بچھو، درندے، خار دار جنگل، آتش، لہو، دھوئیں اور جوش سے بھرے ہوئے دریا، صحرا، غار، کھڈ، جادو، ٹونا، فسوں، منتر، سحر اور تعویذ گنڈوں کا بیان ہے۔

مثال کے طور پر ہم داستان امیر حمزہ (طلسم ہوشربا) کے کچھ جادوگر اور جادوگرنیوں کے نام گنواتے ہیں۔

جادوگر

افراسیاب شہنشاہ طلسم ہوشربا۔ کوکب روشن ضمیر شہنشاہ طلسم نور افشاں، ملک احول مربع نشیں (کوکب اور افراسیاب کا پیر بھائی اور ہم مکتب) مشعل جادو۔ اختقاق جادو، ہومان۔ کیوان، ابق سوار برادر ہومان ملک اطلس گلگوں پوش۔ قہرہ، فیلسر اور اس کا بھائی شہرہ فیلسر (کوہستان ہوشربا کا ناظم) گیہان اژدر سوار، اثراد خوک پیکر۔ سرما ابریق۔ آبیار۔ زوال جادو۔ ملک اخضر گوہر پوش۔ فرعون جادوگر، شہاب گلگوں پوش۔ شریر جادو۔ جبیر جادو، کیوان اژدر، سموم جادو توسن جادو حیات جادو، عفریت طلسمی (دیو) محیط جادو۔ رخان سیاہ، دد مواج بن گرداب آدم خور لطمہ صد گوش، دریا نوش۔ سر خاب وحباب

آفتاب شعلہ خور، مہر جادو، نیرنگ جادو، ہبران جادو، افزاش، سرود جادو، ساحر مہتی دمامہ جادو، سرمست، چیچل جادو، اسرار تاجدار، معمور، صندلاں صندلی پوش، اقوال چرم پوش، شہریز جادوگر، منصرم جادو، معذہ آدم خور، شہنشاہ برجیس زریں علم۔

جادوگنیاں

ملکہ تاریک شکل کش (افراسیاب کی دائی ماں) ملکہ ماہیان زرد پوش۔ ملکہ شوخ موئے کاکل کشا، آفتاب شمشیر زن۔ نازک چشم، مہرخ سحر چشم، بہار، مجلس، جادو، ہلال سحر افگن ملکہ حیات جادو، ماہیان زمرد پوش (زنانی افراسیاب) شرارہ جادو، شگوفہ سحر ساز، ملکہ اسرار جادو، آفات چہار دست (دادی افراسیاب) ملکہ لعل سخنداں و ملکہ یاقوت سخنداں (ملک اخضر گوہر پوش ناظم حجرۂ پنجم کی بیٹیاں) ملکہ گلشن جہاں افروز، ملکہ مشتری ستارہ طلعت (زنانی کوکب) ملکہ ناہید مرصع پوش۔ ملکہ گلچیں، ملکہ اختر جہاں افروز۔ مدہوش حور پیکر، ملکہ آسمان پری۔ ملکہ جیحوں سبز پوش۔ مجوب کاکل کشا۔ تراں اختر مروارید گلگونہ جادو، مروارید گلنار۔ ملکہ عجائب زعفران پوش، برق لامع۔ برق خاطف۔ برق خنداں۔ برق بلاخور (بہنیں) نسیم جالندری۔ ملکہ کندن۔ ملکہ مرجیں الماس پوش۔ ملکہ ماران زہین کن۔ ملکہ بادیان جادو۔ ملکہ شعلہ حسن فیروزہ فیروزہ پوش، دریا بار جادو۔ صفت، سحر ساز وغیرہ۔

ان میں سے کوئی طاؤس زریں بال پر، کوئی گینڈے پر، کوئی اژدر پر کوئی مرکب پر۔ کوئی عقاب بلند پرواز پر، کوئی شیر پر، کوئی باز پر۔ کوئی بط پر اور کوئی قرقرے پر سوار ہے۔

ان کے علاوہ بیشمار پریاں، پریزاد، اپسرائیں۔ شہزادیاں حسین لونڈیاں ستم شعار کنیزیں۔ سنگدل باندیاں، کشور وزیر زادیاں، ہرجائی امیرزادیاں اور بے شمار چرند پرند ہیں۔

ان کے علاوہ

غول، چھلاوے، قسم ہا اعد عجیب عجیب بلائیں ہیں۔ کسی کے سر پر سینگ، کسی کا قد پہاڑ ایسا، کوئی مردم خور، کوئی سو من کا پتھر اٹھا کر مارتا ہے اور کوئی دو سو من کا اور کوئی وحشت و بربیت کا مجسمہ ہے غرضیکہ مصنف کسی چیز کو جس قدر بھیانک بنا کر پیش کر سکتا تھا، کیا ہے۔

کہیں حباب آنکھیں نکال لیتے ہیں۔ کہیں پتلے لڑتے ہیں۔ کہیں موجہائے دریا خنجر براں بنتی ہیں، کہیں چڑیاں بولتی ہیں، کہیں مچھلیاں آواز دیتی ہیں اور کہیں چرند و پرند دشمنوں کی خبریں پہنچاتے ہیں۔

داستان سرا، ان ہی چیزوں پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر عجیب و غریب مخلوق دکھاتے ہیں جن کا کچھ حصہ انسانی ہوتا ہے، اور رہا تی حیوانی

حاتم طائی میں ایسے جانور ہیں جن کا سر انسانی ہے اور بدن مور کا ہے۔

داستان امیر حمزہ (خلیل علی خاں اشک) میں ایسے آدمی ہیں جن کا چہرہ انسانوں ایسا لیکن کان ہاتھی کے ہیں۔ ان کے بادشاہ کا نام قریشی تاجدار ہے۔

اسی داستان میں عفریت دیو، ہرنا دیو، مارنق چلینی دو سر کا دیو، سموم دیو، کتے کے سر والے دیو، گائے کے سر اور سینگوں والے دیو، اور پریوں کے علاوہ سمندام کے ایک دیو کا بھی ذکر ہے جسے ایک ہزار ہاتھ لمبے قد کا دکھایا ہے (اس دیو کا بھی امیر حمزہ ہلاک کرتے ہیں)

ایک جگہ ایک اژدہا ذکر بھی کیا ہے جس کی پھونک سے حالت کوس یکسر آگ لگ جاتی ہے اور سب کچھ جل جاتا ہے۔ یہ اژدہا جب اندر دم کھینچتا ہے اس میدان کے چرند، پرند، جھاڑ اور آدمی وغیرہ سب اس کے منہ میں جا پڑتے ہیں امیر حمزہ نے جس وقت اسے ہلاک کیا تو چاروں طرف دھواں پھیل گیا۔

ان داستانوں میں بلاؤں اور فوق الفطرت باتوں کے علاوہ انسانوں کے کردار، افعال خوراک، حرکات اور ان کے قد و قامت کے بارے میں بھی عجیب عجیب باتیں بیان ہوئی ہیں۔

داستان امیر حمزہ (اشک) میں قلعہ سنگ رو احل کا مالک عادی کرب جس کے اٹھارہ شہزور بھائی ہیں۔ اکیس گز کا ہے اور سر پر سات پگڑیاں باندھے ہوئے اور سات شملے ہر طرف لٹکے ہوئے۔ اکیس گز نواند کا دور جس پر فولادی کمر بند باندھے ہوئے۔ عادی کی خوراک یہ تھی "ہر صبح اکیس اونٹ کے بچوں کی نہاری کھاتا اور کھانے کے بعد اکیس شیشوں کا تحت القہوہ پیتا تھا۔ اس کے باورچی خانے سے اکیس من بوجھ اونٹ کے پیاز کے چھلکے دونوں وقت نکلتے تھے۔ امیر نے اس کا روزینہ اکیس من مقرر کیا جو صرف اس کے کھانے پر خرچ ہوتا" داستان گو نے مبالغہ کے علاوہ "اکیس" کو خوب نبھایا ہے۔

۲۔ لندھور بن سعدان جزیرہ سراندیپ کا بادشاہ ایک ہزار سات سو من تبریزی کا گرز ہاتھ میں رکھتا ہے اور اس کا قد ایک سو دس گز کا ہے۔

۳۔ بہمن ارجاسپ کے پاس سات سو من کا گرز ہے۔ عمر بن حمزہ اس کے ساتھ ہزار من کے گرز کے ساتھ لڑتا ہے۔

۴۔ ژوپین کے فرزند عسکہ کا قد پینتالیس گز کا ہے وہ سات ہزار من کا گرز رکھتا ہے اور شداد کے گھوڑے کی نعل اور میخ کو ایک سو بیس من لوہا لگتا ہے — !

۵۔ فرخاری کی عمر سات سو سال بتائی ہے اور شہر بربر کا سردار الجہ شصدت گزی جو نوشیرواں کی مدد کو آتا ہے۔ ایک سو بیس گز جست مار کر حریف کو مارتا ہے۔

۶- ہر دم کا قد چالیس گز ہے۔ گاؤ دنگی ایک سو چالیس گز کا ہے اور چودہ سو من کا اٹھائے بیل پر سواری کرتا ہے اور امیر حمزہ کے ساتھ اکیس دن لڑتا ہے۔ اسی طرح قندر سرشیان، یقمار خاوری، رستم پیلتن کے گرز سات، آٹھ سو اور ہزار من کے بتلاتے ہیں۔

عمر عیار کی پیدائش عجیب حالت میں ہوتی ہے۔ حلیہ کے بارے میں بھی سن لیجئے یہ جو رنگ کا کالا ہے۔ قد تیرہ گز لمبا اور سر پہ پانچ گز مذے کی ٹوپی اور اس پر لومڑی کی دم کا طرہ لگا ہے۔ اور وہ دم ہمیشہ ہلتی رہتی ہے ...... کمان شانے پر لگائے ہوئے اور کاغذ کی ڈھال پشت پر ڈالے ہوئے .... اور اٹھارہ من کی ایک چھری کمر میں باندھے اور بارہ من کی چھڑی ہاتھوں میں لئے باہر کھڑا ہے"۔

داستانوں کے ہیرو بے پناہ قوت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اور دشمن کو ہر طرح پچھاڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

داستان امیر حمزہ (رانتک) میں امیر حمزہ نے جب استفنا نوش کو گرفتار کر لیا تو اس کا بھائی صد فنوش میدان میں آیا اور امیر پر حملہ آور ہوا۔ مصنف کی زبان میں "امیر نے ایک ہاتھ سے تلوار کو روکا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی کمر کی دوال پکڑی اور اپنا پاؤں رکاب سے نکال کر اس کے گھوڑے کو ایسی لات ماری کہ گھوڑا اس کے نیچے سے نکل کر چالیس قدم دور جا پڑا اور صد فنوش امیر کے ہاتھ میں رہ گیا"

اس قسم کے ہزار ہا واقعات ہیں جن میں ہیرو اور اس کے ساتھیوں کو بلوان اور بے حد طاقتور دکھایا گیا ہے۔ کہیں وہ ہزار من کے پتھر کو ٹھوکر مار کر دور کرتے ہیں اور کہیں یکہ و تنہا، لاتعداد دیوؤں کی ہلاکت کا باعث بنتے ہیں۔

دمشق کے بادشاہ ہوم کے ساتھ جنگ کے واقعات پر غور فرمائیے۔

"ہوم چالیس من سونے کی اینٹ میدان میں رکھ کر اس پر کھڑا رہتا اور چار سو پہلوان مل کر زور کرتے لیکن ہوم کا پاؤں ذرا نہ ہلا سکتے اور جب ہوم اپنا پاؤں جھٹکتا تو سب پہلوان دُور جا گرتے ــــــ" لیکن بقول مصنف جب عمر نے اس کے (ہوم) بازو پر لات ماری تو اس کا بازو گُنگھُنی تک بھر کنے لگا۔ امیر حمزہ نے ہوم کا پاؤں بائیں ہاتھ سے پکڑ کر اسے اٹھایا اور زمین پر پچھاڑ دیا اور عمر نے وہ چالیس من سونے کی اینٹ اٹھا کر توبرہ میں رکھ لی۔

امیر نعرہ مارتے ہیں تو ان کی آواز سولہ فرسنگ تک جاتی ہے اور دشمن کے گھوڑے سواروں کو زمین پر گرا کر بھاگ جاتے ہیں۔ امیر حمزہ کے نقارے کی آواز اٹھارہ کوس تک جاتی ہے۔ اس نقارہ پر سکندر ذوالقرنین لکھا ہے اور اسے اٹھارہ تبریزی وزن کی چوب سے بجایا جاتا ہے۔

مبالغہ، تصنع، جھوٹ قدم قدم پر ہے اور داستان کی جان ہے۔۔۔۔۔۔۔۔

داستان گو نے زبان کی تزئین اور داستان کی آراستگی کا ہر جگہ خیال رکھا ہے۔ بزم، جشن، سواری، بارات، رقص، موسیقی، ضیافت اور شکار وغیرہ کے بیانات داستانوں کی خاص جاگیر ہیں اور مرغوب موضوع ہیں۔ نوشیرواں، مقبلوں کے بادشاہ ژوپین کی دعوت کرتا ہے اور جب دسترخوان زر دوزی پر سونے و روپے کے طباق اور پیالے اور رکابیاں رکھی گئیں تو نان وغیرہ کی قسمیں مصنف گنواتا ہے۔

"ہر قسم نان، زرہین نان، ورقی و نان گلزار و نان پنیر و نان آبی و نان روغنی نان خطائی، نان چپاتی نان پر اور ایک نان گاؤ دیدہ زبان گاؤ زبان اور پلاؤ بیگمی اور پلاؤ موتی پلاؤ، قیمہ پلاؤ بیری و پلاؤ کاشانی اور کباب مرغ کباب سیخ

وکباب شامی وکباب تکہ اور ہریسہ وسموسہ وپلاؤ وقتلمہ اور سیب بہی ونا شپاتی وشربت وقند وساقی سردسی وبادام وچھوہارا وپستہ وکشمش وانگور وانجیر وغیرہا اور ہر قسم کا میوہ لاکر حاضر کیا ......"

امیر حمزہ کا لشکر

"اور لشکر کا نشان لے کر عمر معدی کرب کہ جس کا قد چوّن گز لمبا اور پیٹ گھوڑے کی ایال پر اور چوتڑ پیٹھ سے نیچے پڑے تھے، اپنے چوالیس بھائیوں اور چودہ ہزار مسلح ومکمل غرق دریائے آہن اور مستور پیدا ہوا...... پھر لندھور سات سو ہاتھی داہنی طرف اور سات سو بائیں طرف اور ایک سو بیس چھتر شاہی کی جمعیت سے ایک ایک سو دس گز قد کا، نیل منگوسی پر سوار ہو کر آیا...... اس کے بعد جیوران شہپال شاہ دو چھتر مراتب کے نیچے آیا پھر اس کے بعد کورنگ آیا پھر دو بھائی شہزادے یونان کے آئے (فرزند مدیث یونانی) بعد ان کے استغلان بڑی فوج سے آئے پھر شاہ نامر مصری آیا، پھر سات بھائی زابلی آئے...... حلب کے شہزادے آئے اور ان کے بعد شیر بابک شیردانی آیا...... پھر شال مغربی آیا، پھر ریحان طبغی پھر خاوری پھر قندر سرشیاں حاتمی پھر سرکپ ترک پھر برہنہ طلسی اور دیوانہ طلسی پھر الجوشعت گری پھر سعد طوقی پندرہ گز کے قد کا جوان جو ایک من کا طوق گلے میں ڈالے تھا اور اس کے جمال کی تابش سے آفتاب شرمندہ ہوتا تھا...... پھر قارون کی بہن بمیت رستم، پیلتن اور پیل تن آئے اس کے بعد سعد بن عمر بن حمزہ آئے...... پھر قنبار خاوری آیا اور اس کے بعد دورباش کی آواز اور عیاران عمرو بن امیہ آئے۔ پھر سرخیل پا پوش پوشان بساط پوشان بنی آدم مولانا معظم جامع الفضل والکرم وذنب بید رنگ قلعہ گیر بے جنگ صاحب فنظورہ ورنگ مردان سرہنگ یعنی جناب جنت مآب شیخ الاحباب خواجہ عمرو بن امیہ ضمیری نامدار چراغ لشکر اسلام جست مارتے ہوئے

مندے کا کرتہ کاغذ کی ٹوپی رسی سے کمر بندھی ہوئی چند تیر بے پر و پیکان بازو سے لگے ہوئے اور بجائے سپر کے ٹوکری پشت کے پیچھے لگی ہوئی۔ شکل مبارک لائق تصویر ناریل کا سا سر، دھاگہ سی گردن، زیرہ سی آنکھیں۔ چھوٹی سی ناک بادام سے کان، طباق سا پیٹ، رسی سے ہاتھ اور ایسے ہی پاؤں زنبیل اور توبرہ گلے میں پڑا چلا آتا ہے۔ اس کے پیچھے یاران ہزار غلام زریں لباس، تازی ترکی گھوڑوں کو ساتھ لئے ہوئے پیادہ چلے آتے ہیں ——— اس کے بعد حمزہ کا نشان ہے اور اس کے نیچے آفتاب اہل عرب عم رسول آخر الزمان امیر کشور جہانستان حمزہ بن عبد المطلب ہے اور ان کے پیچھے ابو طالب و حارث و ہاشم اور دوسرے بھائی ہیں۔ بعد ازاں تیس ہزار غلام ترکی و رومی چینی و زنگی اور ہندی زریں قبا و زریں کمر زریں پگڑیاں پہن کر تازی گھوڑوں پر سوار"

اس قسم کی تحریر سے داستان گو اپنی لفاظی کا لوہا منوانا چاہتا ہے۔

(طلسم ہوشربا) عمرو، افراسیاب، اختقاق اور چالیس دوسرے سرداروں کو بیہوش کر کے نعرہ لگاتا ہے "منم بہتر بہتران و بہتر بہتران سر نہنگ سر نہنگاں بساط بلاد بنی آدم مولانائے معظم و مکرم جامع الفضل والکرم دوندہ بید رنگ قلعہ گیر بے جنگ مرداں را سرہنگ نامرداں را پالہنگ صاحب قنطورہ و تنگ رفیق قدیم زلزلہ قاف شانی سلیمانی نامی نامور خواجہ عمرو۔"

بعض جگہ تو تحریر بھی کرداروں کی طرح عجیب و غریب ہے۔

افراسیاب بیٹھا سامری نامہ پڑھنے پکارنے لگا یا سامری و جمشید یا لات و منات اے خداوندم جمشید اے ٹک ٹوٹا جونک جھوٹا آزمل خرمل خیرا ڈبا میں نے دل سے خطائے احوال معاف کی۔"

"عزانات" بھی دیکھ لیجئے۔

طلسم ہوشربا
"ذکر داستان حیرت بیان پہونچنا اتفاق جادو کو لے کر افراسیاب کا بمقابلہ لشکر مہرخ و تباہی لشکر مہرخ اور وقت پر پہنچنا خواجہ عمر کا مع ملک احول مرزع نیش و ذکر قتل اتفاق"

"ذکر داستان حسرت رہ بیبت گرفتار ہونا جملہ سرداران ملکہ مہرخ سحر چشم کا سحر تاریک سے اور عمرو کا ان سب کو بچانا خوراک تاریک دے کر اور حال حال لکھنا عیاری عمرو کا اور غصے میں جا پڑنا تاریک کا لشکر مہرخ پر اور پتا ملنا بارگاہ اسد غازی کا عجب داستان رنج والم ہے خمسہ۔"

شہروں کے نام بھی عجیب وغریب اور مخصوص قسم کے ہوتے ہیں۔ مثلاً آرائش محفل میں ہین۔ گل بکاؤلی میں یورپ کے خطے کا کوئی شہر جسے آگے شرقستان کہا گیا ہے۔ فسانۂ عجائب میں سرزمین ختن کا کوئی شہر۔ گل صنوبر میں ترکستان کی ولایت میں چین ماچین وغیرہ۔ اسی طرح باغ وبہار میں سراندیپ، نیم روز اور داستان امیر حمزہ (اشک) میں شہر بربر، شہرستان زریں جیسے نظر آتے ہیں۔

داستان امیر حمزہ اور بوستان میں تو نام نہایت ہی خوش آہنگ، شاداب شگفتہ اور رومانی ہیں۔ جن میں مٹھاس ہے، حلاوت ہے، موسیقی ہے۔ ترنم ہے مثال کے طور پر کوچک باختر، بالاختر، مہرخ سحر چشم، ہلال سحر انگن، بہار بھلا سخنداں۔ یاقوت سخنداں۔ اختر جہاں افروز، مرواریدِ گلنار۔ فیروزہ فیروزہ پاپوش، زیر جبدنگار۔ زرنگار وغیرہ۔

اب چند مقامات ملاحظہ ہوں۔

ستم ہوشربا، طلسم نور افشاں، طلسم نادر فرنگ، طلسم اسکندریہ، کوہ ہفت رنگ صحرائے ہول خیز، ہزار برج، زعفران زار سلیمانی، طلسم ہفت پیکر، چار زمرد دریائے خوں رواں، پل پری زاداں، طلسم باطن باغ سیب، پردہ ظلمات گنبد سامری۔

یہ نام داستان امیر حمزہ (طلسم ہوشربا وغیرہ) سے تھے ایسے ہی بوستان خیال میں بھی ہیں۔

قصر اسرار۔ مشکوے حیرت، حمام زناں، میخانہ بیخودی، مقام الامتحان۔

طلسم حیرت کدہ آصفی۔ شہر صورت پرستاں۔ بیابان وحشت وغیرہ۔

عورتوں اور مردوں کے نام بھی شہروں ہی کی طرح ہیں۔

تاج الملوک، بکاؤلی، آزاد بخت۔ بہزاد، لقمان، منصور، جان عالم، مہر انگیز،

ایرج، تورج، بدیع الزماں، علم شاہ

طلسموں کے اندر یہ ذائقہ اور بھی گاڑھا ہو جاتا ہے۔

خونخوار خلاقی۔ کوکب روشن ضمیر، مخمور سرخ چشم۔ آفتاب جادو دست، سرخ موئے کاکل کشا۔ برہمن رویں تن۔ ملکہ بہار جادو۔ خورشید تاج بخش نوبہار گلشن افروز۔

حاتم طائی سے ایک بلا کا حال سنیئے۔

تھوڑی دیر بعد گنبد کی مانند ایک شکل نمودار ہوئی۔ اس صورت سے کہ نو ہاتھ، نو پاؤں، نو منہ بدن میں اور لڑھکتا چلا آتا ہے۔ اور دھواں و شعلہ ہر منہ سے نکلتا ہے" !

داستان امیر حمزہ (طلسم ہوشربا) وغیرہ میں فوق الفطرت کی معراج ہے اس سے زیادہ انسان سوچ ہی نہیں سکتا۔

ایک دیو کا حلیہ ملاحظہ ہو۔

"دریا سے ایک دیو نکلتا ہے کوئی ہزار نو سو گز کا اس کا قد ہے۔ دو سینگ سر پر مثل دو میناروں کے ہیں۔ آنکھیں مثل اس خون کے سرخ ہیں۔ چنگال مانند شیر کے ہیں۔ مگر اتنا بڑا چنگال ہے کہ کئی ہاتھی اس میں آ سکتے ہیں۔ منہ سے اس کے مانند اژدہا کے وہاں شعلۂ آتش نکلتے ہیں جس وقت وہ دیو دیوار سے نکلتا ہے۔ شہر میں آتا ہے۔ سو سو آدمی چنگل میں دبا لے جاتا ہے اسی طرح ان کا ہتھیار دار شمشاد کئی سو من کا ہوتا ہے۔"

ایک اور دیو (برق لامع جب یاقوت کو زخمی کرتی ہے۔)

یاقوت نے پہاڑ پر جا کر ٹکر ماری پہاڑ تھرا گیا یکایک پہاڑ پھٹا دل کوہ سے ایک کوہ پیکر دیو مہیب بڑے بڑے ہاتھ پاؤں، سر گنبد مکان کہنہ ہاتھ پاؤں ٹھنٹے نخل چنار کے سینہ صحرائے دیراں موئے جسم مثل نشتر کوہ پیکر خود سر پیچ مار کر سامنے آیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا ——"

اس دیو کے کارنامے

زمین چنگل مارے ان چار ہزار (کنیزیں) کا خاتمہ کر کے طرف لشکر اسلام کے بڑھا .... دو دو کوس تک اس کا ہاتھ جاتا ہے۔ پانچ کوس پر اس کا قدم پڑتا ہے .... چنگل مار دو سو کو اٹھایا چھنکا مار گیا چباتا بھی نہیں ..... دس ہزار کو دم بھر میں کھا گیا ...... دس کوس سے اس کا سر دکھائی دیتا ہے

جب شجاع اسلام کی کشتی کسی دیو سے ہوتی ہے تو وہ ہاتھ یا سینگ سے پکڑ کر اسے زمین پر گرا لیتا ہے اور سینے پر چڑھ کر سر دھڑ سے کھینچ لیتا ہے

حیرت ہے کہ ہنر ارگز قدو الے کے بینگ یا ہاتھ تک کس طرح رسائی ہوتی ہے۔

جیسا کہ گزشتہ سطور میں ذکر ہو چکا ہے داستان امیر حمزہ میں سحر اپنے انتہائی عروج پر ہے۔ اس سے زیادہ فکر کی رسائی ہو ہی نہیں سکتی۔ سب سے بڑا جادوگر شہنشاہ طلسم ہوشربا، افراسیاب ہے۔ اسی طرح چند اور نہایت بڑے ساحر شہنشاہ کوکب روشن ضمیر، شہنشاہ لاچین۔ ملکہ اطلس گلگوں پوش۔ برہمن رویین تن اور ملکہ تاریک شکل کش ہیں۔

ان کی سحرکاریاں بھی عجیب ہیں۔

افراسیاب جب زانو پر ہاتھ رکھ کر اپنی ہتھیلی دیکھتا ہے تو اس میں آنے والی گھڑیوں کا سعد و نحس اس پر منکشف ہو جاتا ہے۔ غیب کا حال بتلانے کو سامری اور اوراق جمشید ہیں جب کوئی بات معلوم کرنی ہو، ان میں دیکھ لی جاتی ہے اسی طرح دوسرے جادوگروں کے پاس بھی مختلف ذرائع ہیں۔

کوئی جادوگر آگ کی بارش کرتا ہے۔ کوئی مٹھی بھر خاک آسمان کی طرف اچھالتا ہے تو پتھر اور چٹانیں برسنے لگتی ہیں۔ کوئی سمندر چھوڑ دیتا ہے۔ کوئی زمین شق کر دیتا ہے۔ اور ایک وہ ہے کہ فضا میں آسمان کے نیچے جال پھیلا دیتا ہے۔ اور پھر اس جال میں دشمن کے آدمی معلق نظر آتے ہیں۔

بعض ساحر خاص سحر استعمال کرتے ہیں۔

مثلاً ملکہ بہار، بہار لا کر دیوانہ کرتی ہے۔ بران اختر مروارید استعمال کرتی ہے اور باغبان قدرت پھولوں کی گیند سے سحر کرتا ہے۔

جادوگروں اور سحر نواز ہستیوں کی طرح عیاری کے ضمن میں بھی ایسی ایسی باتیں ظہور میں آتی ہے کہ عقل مبہوت ہو جاتی ہے۔

امیر حمزہ کے ان گنت بیٹے پوتے اور پھر ان کے بیٹے پوتے، کے علاوہ

ایک لاکھ چوراسی ہزار عیار رہیں۔ عمرو عیاروں کا بادشاہ ہے۔ اس کے نائبوں میں برق فرنگی، قرآن حبشی۔ ضرغام اور جانسوز ہیں۔ اسی طرح افراسیاب کے لشکر کی عیار بچیوں میں صرصر۔ صبار فتار، صنوبر، شمیمہ اور تیز نگاہ ہیں ......

یہ عیار اور عیار بچیاں، سوانگ بھرتے ہیں، ایک دوسرے کو زک دیتے ہیں۔ حیرت خیز کام سرانجام دیتے ہیں۔ دراصل طلسم کشا بھی عیار رہیں۔ وہ نیمچہ، اگرچہ تیغہ اور کمند استعمال کرتے ہیں لیکن ان کے اصل ہتھیار دارو ئے بیہوشی سفوف بے ہوشی۔ بیضہ بے ہوشی، پروانہ بے ہوشی اور حباب بے ہوشی ہیں۔ وہ شمر ابا بیں سفوف ملا کر بھی جادوگروں کو بیہوش کرتے ہیں اور منہ پر حباب مار کر بھی اور پروانے اڑا کر بھی۔

عیار جادوگروں سے بھی بڑھ کر کام کرتے ہیں

عمرو بصورت احول مربع نشیں دام مکر بچھا کر شہنائی حاصل کرتا ہے۔ افراسیاب حجرہ سوم کے مالک شہنانواز کے پاس سے پلنگ خونریز کو شہنائی جمشیدی کے ساتھ لے کر آتا ہے۔ تو عمرو راستے میں ملک احول مربع نشیں (جو مر چکا ہے) کا بھیس بھر کر بیٹھتا ہے۔ پتھر کی تصویر بن کر روتا ہے۔ اور افراسیاب سے درخواست کرتا ہے کہ اسے معاف کر دے تاکہ اس عذاب سے اسے نجات ملے۔ ساتھ ہی اس کے منہ سے دھواں نکلتا ہے۔ اور تصویر سنگی اپنے عذاب کا حال سناتی ہے .... پھر وہ (عمرو) خداوند جمشید بنتا ہے اور مصنف کے الفاظ ہیں۔ .... "ایک شخص بصورت مہیب کالی کالی صورت سر برہنہ بڑا سا تیغہ پر آب ہاتھ میں کھینچا ہوا آنکھیں لال ہوئیں منہ سے شعلہ ہائے آتش نکل رہے ہیں سامنے آتے ہی آواز دی منم ملک الموت قدرت خداوند جمشید"۔ جمشید کے ایک طرف فرشتۂ رحمت اور دوسری طرف ملک الموت بیٹھا ہے —— خداوند جمشید عمرو اور فرشتے

اس کے عیار ساتھی ہیں۔ اور اس طرح عمرو شہنائی جمشیدی چھین لیتا ہے۔ یہی نہیں اس میں بھی ہزارہا گنا مشکل کام یہ عیار سرانجام دیتے ہیں۔ عیاری اور بہادری کے علاوہ ان کے پاس پیغمبروں کے عطا کردہ بیش بہا تحفے بھی ہیں۔

امیر حمزہ کے پاس اسمٰعیل نبی کا پیراہن، ہود نبی کا خود، داؤد پیغمبر کی زرہ بکتر یوسف پیغمبر کے دستانے، صالح نبی کے موزے، یعقوب پیغمبر کا کمر بند، الیاس کی دو تلواریں صمصام اور قمقام، نوح علیہ السلام کا نیزہ، اور خضر کا عطا کردہ گھوڑا ہے۔ اس کے علاوہ خدا کا یہ بھی حکم ہے کہ کوئی پہلوان امیر کی برابری نہ کر سکے گا۔

ان تحائف کے علاوہ کوہ سراندیپ پر حضرت آدم کی قدمگاہ کی زیارت کرتے وقت انہیں حضرت آدم "بازوبند" بھی عطا کرتے ہیں جس کی وجہ سے کارزار میں زخم نہیں آتا اور ہاتھ نہیں تھکتا۔ اور اس میں بے پناہ قوت آجاتی ہے ——— علاوہ بریں سولہ فرسنگ آواز پہنچنے کی نوید بھی دی۔

اسی طرح عمرو اور مقبل کو نبیوں کی طرف سے تحائف ملتے ہیں۔ مقبل کو پانچ تیر اور ایک کمان عطا ہوتی ہے جس کی وجہ سے تیر اندازی میں اس کا جواب نہیں ہوتا۔

خضر علیہ السلام عمرو سے کہتے ہیں کہ تجھ سے کوئی آگے نہیں نکل سکے گا۔ چنانچہ داستان میں ایسا ہی ہوتا ہے ——— مثلاً نوشیرواں کی بیٹی مہر نگار کے لڑکا پیدا ہوا تو عمرو نوشیرواں کو یہ خوش خبری دینے کے لئے مدائن جاتا ہے۔ اور چھ ماہ کا راستہ دو دن میں طے کرتا ہے۔ عمرو کی تیز رفتاری کے اور بہت سے واقعات ہیں۔

عمرو کے پاس دیو جامہ، زنبیل، گلیم، ہتھوڑا داؤدی، داؤدی دونارا، سکندر کا آئینہ، جال الیاسی اور مہرہ سفینہ وغیرہ بھی ہیں۔

اور اگر ان تحائف سے بھی کام نہیں چلتا تو خواجہ خضر علیہ السلام یا دوسرے بزرگ مدد کو آجاتے ہیں۔

امیرؔ پر لاتعداد عورتیں عاشق ہوتی ہیں اور امیرؔ کتنی ہی شادیاں کرتا ہے۔ داستان امیر حمزہ میں امیر کی بہت سی شادیاں ہوتی ہیں جن میں نوشیرواں کی دو بیٹیاں مہرنگار اور مہرافروزہ، اسماء پری، رابعہ پلاس پوش اور شاہ ماژندران کی بیٹی ٹھیلی سوار وغیرہ بھی شامل ہیں۔

غرضیکہ جس قدر غلو سے کام لیا جا سکتا ہے۔ داستانوں میں موجود ہے اور ان کی تعمیر و تشکیل سرے سے ہی غیر فطری عناصر، مبالغہ اور تصنع سے ہوئی ہے۔ اگر یہ چیزیں داستان میں نہ ہوں، تو داستان، داستان نہ رہے۔

داستانوں کی ترقی اور زوال کی وجوہات۔

اردو نثر کی باقاعدہ ابتدا فورٹ ولیم کالج کے قیام سے ہوتی ہے اس ادارے کے قیام کی تہہ میں علم و ادب یا زبان کی خدمت سے کہیں زیادہ سیاسی ضروریات کارفرما تھیں ——— جو نئے انگریز کمپنی میں ملازمت کے لئے ہندوستان آتے تھے۔ ان کے لئے ہندوستانی زبان سیکھنا ضروری تھا۔ لیکن تعلیم و تدریس کے لئے اردو نثر میں کتابیں ہی نہیں تھیں ——— شمالی ہند کی اردو نثر پر اس سے پہلے فارسی چھائے ہوئے تھے ——— نئی کتابیں تخلیق کرنے کرانے میں ایک مدت درکار تھی۔ اس لئے فورٹ ولیم کالج والوں نے نئی کتابیں تصنیف کرانے کی بجائے دوسری زبانوں سے تیار مسالہ لینا زیادہ

سہل سمجھا۔

انگریزوں کو محض ہندوستانی زبان سکھانی مقصود تھی، ہندوستانی علوم میں تربیت دینا نہیں۔ ——— اس کے لئے قصوں اور داستانوں سے بڑھکر اور کیا چیز موزوں و مناسب ہو سکتی تھی۔

اس کالج کی وجہ سے ملک بھر میں اس قسم کی داستانوں اور قصوں کا رواج ہوا اور لوگوں میں تشویق پیدا ہوئی۔

رام پور کے دربار میں غدر سے پہلے اور غدر کے بہت بعد تک اچھے داستان گو رہے ہیں

داستانوں اور قصوں سے گہری وابستگی، دراصل انیسویں صدی کی سیاسی اور معاشی حالت کی رہین منت ہے۔ اس سیاسی اور معاشی حالت نے داستانوں کو بہت ترویج دی اور لوگوں کی نوک قلم سے اس کی تصانیف مترشح ہوئی اور اس ماحول نے بنارس حیدرآباد، لکھنؤ، دلی اور رامپور میں داستان گوئی کے فن کو جلا بخشی اور یہ نشہ تیز سے تیز تر ہونے لگا۔

داستان سرائی اور قصہ خوانی کا سب سے زیادہ رواج لکھنؤ میں تھا۔ طلسم ہوشربا جلد ہفتم کی تقریظ میں پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے ـــ

جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) کے بعد سے جنگ آزادی (غدر) تک افسردگی اور اضمحلال کی ایک پوری داستان پھیلی ہوئی ہے ——— ناظمان سلطنت سے جہانبانی اور حکمرانی کی صلاحیتیں چھین لی گئی تھیں، اور ان کے ہاتھ غلامی کی ڈوریوں میں باندھ دیئے گئے تھے۔ قوم کا کردار اپنی عظمتیں گنوا چکا تھا اور ان کی برتری اور بزرگی داستان پارینہ بن کر رہ گئی تھی ——— ایسے میں ہندوستانی حکمرانوں کے لئے بیکار بیٹھے رہنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ کاہلی کی وجہ سے خالی ذہن عیش کوشی،

اور تعیش پسندی کی طرف راغب ہو گئے اور اس تن آسانی نے انہیں ذہنی تعیش کی تلقین کی اور پھر یہ "ماضی کے جہاں فسانے" داستانوں میں سکون اور گم گشتہ عیش ڈھونڈنے لگے — اور اس طرح راجا کے ساتھ پرجا بھی رنگی گئی۔

داستان نویسی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ادیب طبقۂ بالا سے داد لینا چاہتے تھے۔

داستان سننا اور سنانا ایک دلچسپ مشغلہ بن چکا تھا اور قصہ کی دلچسپی امرا، عوام اور مصنف، تینوں کو زیادہ راس آتی تھی۔ کہتے ہیں کہ قصے، کہانیاں وہاں زیادہ پروان چڑھتی ہیں، جہاں لوگ تن آسان، کم کوش اور زیادہ کاہل ہوں۔ ہندوستانیوں سے ان کی حکومت چھین لی گئی تھی لیکن اس کا نشہ ابھی تک اذہان میں باقی تھا خود بے عمل اور بیکار تھے۔ لیکن اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں پر تفاخر کرتے تھے۔ داستانوں میں چونکہ نشہ کی سی کیفیت مضمر ہے۔ اس لئے انھوں نے اس کا سہارا ڈھونڈھا، — اور ان کے جذبات، ڈھل ڈھل کر، داستانوں میں رونما ہونے لگے اور وہ "عملی اقدام" کے فقدان کے سبب، ماضی کی تابندہ لکیروں پر رقص کرنے لگے۔

داستانوں کے فروغ اور پھلنے پھولنے میں ایک فراری جذبہ بھی کارفرما تھا ان کی دنیا تلخیوں اور کڑواہٹوں سے پناہ دیتی تھی — یہ خواب کی دنیا تھی، اس میں پہنچ کر بے بسی اور بے حاصلی سے خلاصی ہو جاتی تھی اور سننے والے دھل کے محاکاتی بیان، غیر معمولی حسن اور بے پناہ شجاعت کے حسین و جمیل سپنوں میں کھو جاتے تھے۔

زوال

داستانوں کا دور تقریباً ایک صدی تک قائم رہا اور اس کے بعد ان کی گرفت ختم ہو گئی اور ہند کے باسی ناول کی طرف پلٹنے لگے — جس وقت ڈپٹی نذیر احمد نے

اپنا پہلا ناول لکھا ہے، داستانوں کا عہد ختم ہو جاتا ہے۔

داستان کے زوال کے اسباب عیاں اور روشن ہیں۔ ہر زبان میں اوّل فوق فطرت رومانوں کا رواج رہتا ہے آخر میں فطری ناول قبضہ جما لیتے ہیں۔ جو قوم جتنی جلدی سیاست، معاشیات، فلسفہ، عمرانیات اور سائنس کے موجودہ تخیلات کی گرفت کرے گی۔ وہ اتنی ہی جلدی اس سحر سے آزاد ہو گئی۔

یہی وجہ ہے کہ مغربی ممالک میں مافوق الفطرت داستانوں کا خاتمہ پیش تر ہو گیا ہندوستان میں ایسا جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کے بعد ہوا۔ اور سائنسی دور نے داستان کے قصر کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں اور عمر عیار، چہار درویش، حاتم طائی اور جان عالم اپنی اپنی راہیں چھوڑ کر وقت کی گرد میں گم ہونے لگے۔

جب انگریزی تعلیم کا رواج ہوا اور قوم مغربی علوم اور فکر سے آشنا ہوئی۔ سائنس نے جہالت کا قلع قمع کر دیا ——— آزاد اور حالی ایسی شخصیتوں نے نیچرل شاعری کی وکالت کی اور وقت کے بدلتے ہوئے دھارے نے داستان کو پیچھے چھوڑ دیا ——— لوگ سمجھ گئے کہ یہ غیر فطری عناصر کی عکاسی کرتی ہیں اور ہماری صحیح اور اصلی زندگی کو پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ اسی وقت سرسید اور ان کے رفقاء کے کار حالی، شبلی، نذیر احمد، ذکاءاللہ وغیرہ میدان میں آ گئے اور ان لوگوں نے تاریخ کردار نگاری اور تنقید نگاری کے شہپاروں کو جنم دے کر ماحول کو ان دھندلاہٹوں سے قطعاً پاکیزہ کر دیا اور پھر اس علمی میلان نے داستانوں کے رہے سہے اور سسکتے ہوئے جذبے کو بھی خرافات قرار دے دیا ——— حقیقت شناس لوگ جان گئے کہ داستانوں کی دنیا ہماری اپنی دنیا نہیں۔ ان کے افراد ہم میں سے نہیں ——— واقعات مصنوعی ہیں۔ جو روح کو آسودگی اور طمانیت پہنچانے کی بجائے دماغ کو ایک سراب میں لے جاتے ہیں۔ اور ان سے بے عملی پیدا ہوتی ہے۔

افسانہ

داستان کے فوراً بعد ناول اور پھر مختصر و طویل افسانے وجود میں آنے لگے۔ ناول اور افسانے میں بظاہر جو سب سے بڑا فرق نظر آتا ہے وہ تو یہی ہے کہ ناول بہت زیادہ طویل ہوتا ہے اور افسانہ مختصر ——— گو موضوع دونوں کا انسانی زندگی ہی ہے چوں کہ یہاں ناول سے بحث کرنا مقصود نہیں ہے اس لئے ہم افسانے ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ داستان اور افسانے میں زمین آسمان کا فرق ہے فنی امتیاز کے لحاظ سے بھی اور فکر کی بعد سے بھی۔

داستان ایک تیز رو ندی ہے، جو کناروں کو کاٹ کر جہاں تک بس چلے جا سکتی ہے ——— اس کے برعکس افسانہ ایک ایسا خوبصورت اور محدود حوض ہے جس میں شفاف اور پاکیزہ پانی ہلکورے لیتا رہتا ہے یا یوں کہہ لیں کہ داستان ایک، بے ہنگم پہاڑ ہے اور افسانہ، جیسے سا ترشا ہوا پتھر ——— ایک جھوٹ، مبالغہ تصنع اور بناوٹ کا امین ہے۔

اور دوسرا زندگی اور حقیقت کا۔

داستان میں کوئی پابندی نہیں۔ لیکن افسانے کے کچھ قاعدے، ضابطے، اور قوانین ہیں۔ افسانے کا کینوس بہت چھوٹا ہوتا ہے، جس پر انسانی زندگی کے کسی ایک واقعے کسی ایک جذبے اور کسی ایک کیفیت کی تصویر ہوتی ہے۔ جس میں رمزیت و اجمال کا عنصر معانی کے جہان سمو دیتا ہے۔ فنکار کے اشاروں میں کچھ ایسی باتیں ہوتی ہیں کہ جتنا بھی ان پر غور کرتے جائیے، اس میں نئے نئے پہلو پیدا ہوتے جاتے ہیں لیکن وہ ساری زندگی کی تصویر نہیں ہوتی ——— ناول میں کردار نگاری کو سب سے زیادہ دخل ہے۔ لیکن مختصر افسانہ کردار کی کسی ایک کیفیت کو پیش کرتا ہے جس سے اس کی عادات اور افتادِ طبع پر روشنی پڑتی ہے۔ لیکن کردار کا پورا تجزیہ آنکھوں کے سامنے نہیں آتا۔

ناول مختلف طرح کے اثرات انسان کے ذہن پر چھوڑتا ہے۔ لیکن مختصر افسانے میں تاثر وحدت کا ہونا ضروری ہے —— تحیر کا احساس پیدا کرنا افسانہ کی سب سے بڑی خصوصیت ہونی چاہیئے اور تحیر کے احساس کی کیفیت کو شروع سے آخر تک برقرار رکھنا ازبس ضروری ہے۔ اس خصوصیت کے ساتھ آخر میں فنکار اپنی کہانی کو کچھ اس طرح سے ختم کرتا ہے کہ پڑھنے والا کتاب بند کر کے سوچنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے

افسانے میں یہ صفت ہے کہ وہ زیادہ باتیں، کم جگہ میں پیش کرتا ہے

طویل افسانوں میں نیاز فتح پوری کا افسانہ "کیوپڈ اور سائکی" اور احمد شجاع اور مجنوں گورکھپوری کے گنے چنے افسانے ہیں۔ اس کے علاوہ کرشن چندر، حیات اللہ انصاری، احمد ندیم قاسمی اور اختر اورینوی نے بھی ایسے افسانے تخلیق کئے ہیں۔

جس وقت افسانہ وجود میں آیا، اسی وقت سے افادیت اور مقصدیت ان میں سب سے پیش پیش رہی ہے —— قریب قریب۔ ہر فنکار نے اپنے فن کے ذریعے کچھ نہ کچھ کہنے کی کوشش کی ہے۔ کوئی پیغام دینا چاہا ہے ——

فنی اعتبار سے افسانہ انیسویں صدی کے آخر کی پیداوار ہے۔ اردو افسانہ نگاری، فکری اور ذہنی لحاظ سے مغربی افسانہ نگاری کی احسان مند ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمارا اس کی تعمیر و تشکیل میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اور ضرور ہے —— فنی لحاظ سے واقعی اردو افسانے کے سامنے مغربی افسانے کے سانچے تھے۔ لیکن فکری حصہ اس کا اپنا —— مغربی فکر بھی صرف تحریص یا تشویق دلاتی ہے —— یہی وجہ ہے کہ اردو افسانہ نگاری کے سب سے اہم محرکات ہندوستان کی نئی اور کروٹ لیتی ہوئی سماجی زندگی سے وابستہ تھے

پریم چند نے جو حقیقتاً اردو میں افسانہ آفرینی کے موجد ہیں۔ ۱۹۰۷ء سے افسانے لکھنے شروع کر دیئے تھے۔ سوز وطن ان کے افسانوں کے اولین مجموعہ کا نام ہے۔ انگریزی حکومت پریم چند کے افسانوں کے خلاف ہو گئی۔ کیوں کہ ان میں ایک ایسی تحریک پائی۔۔۔ دھر ر

حکومت کے سراسر خلاف تھی۔

ان کے افسانے مغربی فکر کے حامل نہیں ——— ان میں ہند کے دیہات اور ہند کے مظلوم کسان کی بے چارگیاں ہیں ——— اور ہماری اپنی فضا ہے۔

پریم چند ہی کے زمانے میں اردو افسانوں میں ایک اور میلان پایا جانے لگا۔ جو مغرب کے "فن برائے فن" کے نظریے اور فلسفہ جمالیات کی پھواروں میں بھیگا ہوا تھا۔ اردو افسانوں میں اس رجحان کو پھیلانے والوں کے سامنے والٹر پیٹر اور آسکر وائلڈ تھے ——— لیکن ان میں ان کی سی ژرف نگاہی، ان کا سا جذبہ اور شدت نہیں تھی۔ ———

جمالیاتی تحریک کے متوالوں میں جنہیں ٹھوس سماجی حقائق سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ سرفہرست نیاز فتح پوری کا نام ہے ——— ان کے علاوہ سجاد حیدر یلدرم، ل۔ احمد اور مجنوں گورکھپوری بھی اسی زمرہ میں شامل ہیں۔ ان سب کے اسلوب نگارش میں ایک نیا پن اور ایک نئے انداز کو جنم دینے کا جذبہ ہے۔ یہ لوگ حسن کے پرستار تھے ——— حسن آشامیاں، انہیں عزیز تھیں اپنے افسانوں میں حسن و جمال، رعنائی اور رومان کی حسین کلیاں اور دلکش غنچے بکھیرنا چاہتے تھے۔ ان کے پس منظر میں کوئی منظم فکر اور ٹھوس ضابطہ نہیں تھا۔ اس لئے ان کے ہاں فکر میں گہرائی نہیں ہے ——— افادیت نہیں ہے ——— یہ رجحان زیادہ نہ پھلا پھولا اس کے فوراً بعد افسانوں میں مزاح، در آیا، مزاحیہ افسانے لکھے جانے لگے۔ ان افسانہ نگاروں میں عظیم بیگ چغتائی۔ فرحت اللہ۔ شوکت تھانوی۔ ملا رموزی۔ پطرس اور رشید احمد صدیقی وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے بعد سجاد ظہیر۔ احمد علی۔ رشید جہاں، اور صاحبزادہ محمود الظفر نے ۱۹۳۱ء میں افسانوں کا ایک مجموعہ "انگارے" کے عنوان سے شائع کیا ——— اس مجموعہ کے افسانوں میں سماجی قدروں سے بکھیر بغاوت اور انحراف کا جذبہ ملتا ہے ——— اسی لئے یہ مجموعہ بعد میں ضبط کر لیا گیا۔ ———

ے" کے افسانوں میں ایک طرف سیاسی مسائل ہیں جو مارکس کے معاشی

نظریات کے پرتو ہیں اور دوسری طرف جنسی اور نفسیاتی مسائل ملتے ہیں جو فرائڈ کے نظریات سے متاثر ہیں۔ اردو میں اول الذکر مسائل کے وابستگان میں کرشن چندر اور بیدی وغیرہ شامل ہیں اور دوسرے مسائل کی ترجمانی سعادت حسن اور قدرے عصمت چغتائی کرتی ہیں ——— کرشن چندر اور بیدی معاشرہ کے معاشی پہلو اپناتے ہیں اور منٹو و عصمت معاشرے کے جنسی پہلوؤں کو صیقل کرتے ہیں۔

افسانہ میں انسانی زندگی کے جلتے حقائق کو موضوع بنایا جاتا ہے، ان میں سب سے زیادہ جگہ ارباب افسانہ نے محبت کو دی ہے ——— محبت نے افسانے کے پلاٹ، اس کی فنی ترتیب اور اس کی کردار نگاری اور اس کے مقصد اور تاثر کے فن پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ محبت کو افسانے سے اس قدر محبت ہوگئی ہے۔ کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر "زندہ" نہیں رہ سکتے۔

افسانہ اور محبت ایک دوسرے کے لئے قریب قریب دو لازمی چیزیں بن گئے ہیں۔

افسانے میں محبت کے جو نظریے پیش کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اردو میں کہیں نہ کہیں ہاتھ آیا ہے۔ کلاسکی محبت یونانی تخیل اور انگریزی آب و رنگ کی "جائی" ہے۔ رومانیت فرانس اور ترکی نے سونپی ہے ——— مثالی محبت ایران سے اخذ کی گئی ہے نفسیاتی محبت، ان میں سے کئی ایک کے ملنے سے بنی ہے۔

محبت کا جذبہ جو انسانوں میں عام طور پر پایا جاتا ہے "رومانیت" میں ڈوبا ہوا ہے ——— ایسے افسانوں میں جذبات، آگ کے شعلے بن کر لہلہاتے ہیں۔ ہر چیز سے بے چینی، اضطراب جوش اور تڑپ کے آثار اجاگر ہوتے ہیں ——— اردو میں سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں کی ایک ہی مثال کافی ہے ——— موجودہ افسانہ نگاروں میں اے حمید اور مرزا ادیب پیش پیش ہیں مثالی محبت، علی عباس حسینی اور اعظم کریوی کے ہاں ہے ——— کلاسیکیت میں جذبات کی رو دھیمی ہوتی ہے۔ آگ کے شعلوں کو ریشم کے لچھوں میں لپیٹ کر پیش کیا جاتا ہے ایسے افسانوں میں تیز مگر معصوم۔ روشن مگر خاموش۔ رنگین مگر سکون پرور دنیا قدم اٹھاتی، دھیرے

دھیرے سے آگے بڑھتی دکھائی دیتی ہے۔

اِس قسم کے افسانے لکھنا دشوار ہیں۔ ان میں افسانے کے خالق کو ایک نہیں، بلیسیوں باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ایسے افسانوں کے لئے ضروری ہے کہ نفسیات پر گہرا عبور ہو — اثر آہستہ آہستہ بڑھے — دھیمے پن کی کیفیت ان میں ہو — دبا دبا سا جوش، میٹھی میٹھی سی آنچ، پیاری پیاری مضطرب سی دھڑکنیں ان میں ظاہر ہوں ایسی بلند فنی لطافتوں اور فنی بصیرتوں کا پیدا کرنا کسی مبتدی کا کام نہیں اور یہی وجہ ہے کلاسکی محبت کے افسانے ہر ادب میں مقابلتاً کم ملتے ہیں — اردو میں ان کی اچھی مثالیں نیاز فتح پوری کے بعض افسانوں میں ملتی ہیں۔

موجودہ دَور میں افسانوں کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے۔ تھوڑے سے بہت جو بھی افسانے لکھے جا رہے ہیں، ان میں کوئی مستقل فکر اور مخصوص رجحان نہیں ملتا۔

ویسے بھی آج کل افسانے دم توڑ رہے ہیں — اور لوگ ناولوں کی طرف راغب ہو رہے ہیں۔

داستان تو بیچاری ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کا تو ذکر ہی کیا — خیر جو ہو سو ہو — قصّے۔ کہانی کی موت ابھی دُور ہے — انسان زندہ ہے — کہانی زندہ ہے — انسان یگ یگ پر نئی نئی کہانیاں بکھیرتا، بڑھ رہا ہے اور یونہی بڑھتا رہے گا۔

انسان اور کہانی کا جنم مرن کا ساتھ ہے — ایک ساتھ پیدا ہوئے ہیں — اور ایک ساتھ ہی مریں گے۔

آرزو چودھری

Chishtia Press Lahore.